دلچسپ اور سنسنی خیز کہانیوں کا مجموعہ
ماهنامه جاسوسی ڈائجسٹ کراچی
ستمبر 2019
بانی
معراج رسول
صفحات 290
قیمت 100 روپے
کاشف زبیر کے قلم سے آخری سلسلے وار کہانی
الاؤ اندرونی صفحات پر

مدیر اعلیٰ
عذرا رسول

مدیر : لبنیٰ خیال
نائب مدیر : ڈاکٹر نعیم اختر

منیجر اشتہارات
محمد شہزاد خان
0333-2256789

سرکولیشن منیجر
سید منیر حسین
0333-3285269

جلد 49 • شمارہ 09 • ستمبر 2019 • زرِ سالانہ 1200 روپے • قیمت فی پرچا پاکستان 100 روپے •

خط و کتابت کا پتا: پوسٹ بکس نمبر 229 کراچی 74200 • فون 35895313 (021) E-mail:jdpgroup@hotmail.com

پبلشر و پروپرائٹر: عذرا رسول • مقام اشاعت: C-63 فیز II ایکس ٹینشن ڈیفنس کمرشل ایریا مین کورنگی روڈ کراچی 75500
پرنٹر: جمیل حسن • مطبوعہ: ابن حسن پرنٹنگ پریس ہاکی اسٹیڈیم کراچی

مدیر اعلیٰ

چیں بہ جبیں، نکتہ چینی

عزیزانِ من...... السلامُ علیکم!

قارئین کرام! ستمبر کا شمارہ پیشِ خدمت ہے...... 6 ستمبر! یوم دفاع پاکستان جس کے حوالے سے ہمارا ازلی دشمن ہمیشہ بے آرام رہتا ہے۔ وہ بین الاقوامی سرحد عبور کرنے کا مزہ خوب چکھ چکا ہے اس لیے جھنجلا جھنجلا کر کشمیر کی لائن آف کنٹرول پر منہ ماری کرتا رہتا ہے۔ ان کوششوں کا منہ توڑ جواب اسے ہمیشہ رسوائی اور پسپائی کی صورت میں ملتا ہے۔ اب اس نے ریاست جموں و کشمیر پر ایک ہولناک دستوری وار کر کے اس کی خصوصی حیثیت ختم کر دی ہے جس پر پوری دنیا میں مسلمانوں کے ساتھ حریت پسند غیر مسلم بھی احتجاج میں شریک ہیں۔ ان سطور میں ہم مودی کو ہمیشہ موذی قرار دیتے رہے ہیں اور اس کے حالیہ اقدام نے ثابت کر دیا ہے کہ یہ فرقہ پرست، جنونی، گجرات کا قاتل ذہنی طور پر آج بھی چائے فروش کی سطح سے بلند نہیں ہو سکا۔ قدرت نے اسے بھارت جیسے ملک کی سربراہی عطا کی لیکن وہ ابھی تک خود کو اس رتبے کا اہل ثابت نہیں کر سکا۔ اس نے بھارت میں گئو رکھشا کی مہم کے نام پر متعصب ہندوؤں کے ہاتھوں میں مسلمانوں پر ستم ڈھانے کا پروانہ تھما دیا ہے۔ غضب ہے کہ بھارت نے اپریل اور مئی 2018ء کے صرف دو ماہ میں 78 ارب 55 کروڑ روپے کا گئو ماتا کا گوشت دنیا بھر کو برآمد کیا لیکن مسلمانوں کو گائے کو ہاتھ لگانے کی بھی اجازت نہیں ہے۔ اس صریحاً ظلم پر گوشت خور ملکوں کو بھارت سے گائے کا گوشت درآمد کرنے پر احتجاجاً پابندی لگا دینی چاہیے...... مگر ایسا نہیں ہو رہا۔ اپنی گھٹیا حرکتوں پر عالمی برادری کی منافقانہ خاموشی نے موذی کا حوصلہ بہت بڑھا دیا ہے۔ وہ سلامتی کونسل کی تشویش کو خاطر میں لا رہا ہے نہ مفاہمت و مذاکرات پر آمادہ ہے۔ طرہ یہ کہ دیوانگی میں ایٹمی حملے کی دھمکی تک دے بیٹھا ہے...... یہ سوچے سمجھے بغیر کہ اس کا مدِمقابل نہ صرف بہتر اور موثر ترین جوہری صلاحیت رکھتا ہے بلکہ غازی یا شہید کے ملکوتی جذبے سے سرشار ہے۔ اس کو یاد رکھنا چاہیے کہ اس کے جنونی ہم وطنوں نے جب جب ہماری قوم کو للکارا، خاک و خون میں غلطاں ہو کر اپنی جسارت پر ماتم کناں نظر آئے ہیں۔ موذی پر بھارت کے سلجھے ہوئے، امن پرور طبقات بھی کڑی تنقید کر رہے ہیں، اسے اس کے جنگجویانہ عزائم کے مضمرات سے کھل کر آگاہ کر رہے ہیں لیکن اس پرانے پاپی کی کیفیت شراب کے مٹکے سے نکلے ہوئے بدمست چوہے جیسی ہے جو خمار میں شیر کو للکارنے نکلا تھا۔ جنگ ایک خوفناک بلا ہے جو انسانوں کے ساتھ تہذیب، اخلاق، حیا اور اعتبار کو بھی نگل جاتی ہے۔ اس سے گریز ہی میں عافیت ہے لیکن موذی نے اگر کسی مہم جوئی کی حماقت کی تو ان شاء اللہ اسے کہیں منہ چھپانے کی جگہ نہیں ملے گی۔ حالتِ امن میں ہم بہترین ہمسائے ہیں تو دشمنوں کے لیے سراسر قہر و غضب ہیں۔ موذی کے لیے اس دوٹوک پیغام کے بعد چلتے ہیں آپ کے پیغامات کی محفل میں......

چنیوٹ سے عنصر علی کی حاضری ”جے ڈی پی سے وابستہ قارئین کو جن مصنفین کے نام ساری عمر نہیں بھولیں گے ان میں ایک نمایاں نام محترم کاشف زبیر صاحب (مرحوم) کا ہے۔ سادہ اور رواں انداز...... ایک دفعہ تحریر شروع کریں تو بندہ ہوش و حواس کی دنیا سے بیگانہ ہو جاتا ہے۔ میں نے جاسوسی پڑھنا اتفاقاً شروع کیا تھا جب ایک دفعہ کزن کے گھر یہ پڑا دیکھا تو ورق گردانی کرنے لگا۔ انہوں نے کہا کہ لے جانا ہے تو لے جاؤ۔ اس ڈائجسٹ میں دیوی کی ایک قسط تھی جس میں رستم پولیس کا گھیرا توڑ کر ملتان کی طرف نکلتا ہے، اس کے ساتھ گوہرا بھی ہوتا ہے مگر بعد میں ایک لمبے عرصے تک میں نے اس شاہکار تحریر کے لکھاری کا نام نہیں دیکھا۔ بس فہرست میں سے دیوی دیکھتا...... اور پڑھنا شروع کر دیتا...... مگر تب بھی ایک نام تھا جو قسط وار پڑھنے کے بعد میں ڈھونڈتا تھا، وہ تھا مریم کے خان کا اس نام سے مختصر کہانیاں غالباً زیادہ لگتی تھیں اور میں وہ بہت شوق سے پڑھتا تھا جب کبھی بھائی اور میں ڈسکس کرتے تو وہ کہتا کہ طاہر جاوید مغل اور کاشف زبیر کی تحریر ضرور پڑھا کر...... تو میں اسے مریم کے خان کی پڑھنے کو کہتا۔ تب کسے خبر تھی کہ ہم دونوں ایک دوسرے کو ایک ہی رائٹر کو پڑھنے کا کہتے ہیں۔ لکھتے وقت میرے ارادہ الاؤ پر تبصرہ لکھنے کا تھا مگر لکھنا شروع کیا تو بات کہیں اور نکل گئی...... اس لیے میں الاؤ کی طرف واپس آتا ہوں کہ کہیں وہ ٹھنڈا نہ ہو جائے۔ جب فیس بک کے طفیل پتا چلا کہ کاشف زبیر صاحب کی نئی سلسلہ وار تحریر شروع ہوئی ہے تو ایک عجیب سی خوشی محسوس ہوئی۔ ڈائجسٹ لینے کے بعد سب سے پہلے یہی تحریر پڑھی۔ اس کے تعارف میں تو یہی لکھا ہے کہ کچھ اقساط لکھنے کے بعد کاشف زبیر صاحب وفات پا گئے اور آگے ایک اور جانے پہچانے مصنف اسے لکھیں گے...... مگر مجھے لگتا ہے کہ پہلی قسط میں بھی اس محترم مصنف نے کچھ ایڈیٹنگ کی ہے۔ یاد رہے یہ صرف میرا خیال ہے جو کہ غلط بھی ہو سکتا ہے۔ بے شک مجھے مکالمے پڑھ کر ہوا۔ کیوں ہوا شاید اس کی وضاحت صحیح سے نہ کر سکوں۔ ویسے بھی جیسا سر کاشف نے اس کا انجام سوچا تھا سیم ٹو سیم ویسے ہونا ناممکن ہے۔ (کاشف زبیر کے نام سے جتنی اقساط پڑھیں گے، اس کا ہر لفظ کاشف کا تحریر کردہ ہے۔ کسی اور کا نہیں!) نئے مصنف نے تو ظاہر ہے اپنے حساب سے سوچنا ہے اس لیے تھوڑی بہت تبدیلی ہو بھی سکتی ہے۔ ہمارے لیے تو یہی اہم کہ ایک لمبے عرصے کے بعد کاشف زبیر صاحب کا کچھ نیا لکھا پڑھ رہے ہیں۔ کہانی شروع ہوتی ہے

سنہرا جال

نجمہ مودی

کچھ باتیں... کچھ یادیں وقت کی طویل مسافت طے کرنے کے باوجود ذہن و دل سے محو نہیں ہوتیں... ایسا لگتا ہے اس ایک اہم بات پر وقت کی سوئی اٹک چکی ہے... ایسے ہی ماحول میں سفر کرتی کہانی کے انوکھے موڑ... ایک ہی خاندان کی نئی نسل کی ذہنی کشمکش... ان کے بزرگوں سے کئی کہانیاں وابستہ تھیں... اور وہ ان کہانیوں کو عملی صورت میں تلاش کررہے تھے... اپنے خیال کو قول تک محدود نہیں رکھا تھا۔ اسے عملی روپ دے چکے تھے اوران کا یہ خیال محض پانی کا وہ دھارا نہیں تھا جو چٹانوں سے ٹکراتا، الجھتا ہر طرف پانی کی بوچھاڑ کرتا بہتا ہے... بلکہ اس قسم کا دھارا تھا جو نگاہوں کو دکھائی تو نہیں دیتا لیکن جھلستی ہوئی زمین کو رطوبت اور نمی فراہم کرتا رہتا ہے... وہ سب بھی اسی طرح کی مہم جوئی میں مستقل جُتے ہوئے تھے... اس حاصل لاحاصل جدوجہد... میں کسی کی جان خطرے میں تھی تو کسی کی عزت محفوظ نہ تھی... مگر ہر طرح کے خطرے کے باوجود اس سنہرے جال میں ہر شخص گرفتار تھا...

فتح و شکست کے آخری محاذ پر پسپائی اختیار کرنے والوں کی داستان

اس کہانی کا آغاز ایک تاریک اور سرد رات سے ہوتا ہے جب ڈیفنس کی ایک سنسان گلی سے گزرتے ہوئے ملگجے اندھیرے میں ایک نوجوان لڑکی مجھ سے آٹکرائی تھی۔ اس وقت لائٹ گئی ہوئی تھی۔ میں نے اس کے سینڈلوں کی کھٹ کھٹ تو کچھ دور سے ہی سن لی تھی لیکن تاریکی کی وجہ سے اندازہ نہیں ہوسکا تھا کہ کون دوڑتا آرہا ہے اور صورتِ حال کیا ہے۔ میں راستے میں ہی رک کر دھڑکتے دل کے ساتھ انتظار کرنے لگا کہ مجھے کوئی نظر آجائے۔ اس وقت میرے ذہن میں یہ خیال نہیں آیا تھا کہ وہ کوئی نوجوان لڑکی ہوگی اور سیدھی مجھ سے ہی آٹکرائے گی۔

کہانی آگے بڑھانے سے پہلے بہتر ہوگا کہ میں آپ کو اپنے بارے میں کچھ بتاتا چلوں۔ میں ایک شریف، معزز، ادھیڑ عمر اور آسودہ حال شہری ہوں۔ میرا امپورٹ ایکسپورٹ کا بزنس ہے جو اچھا چل رہا ہے۔ میرے دو نوجوان اور اسمارٹ قسم کے بیٹے ہیں جو تعلیم کے ساتھ ساتھ تھوڑا بہت وقت بزنس کو بھی دیتے ہیں۔ میں نے اپنے کشادہ دفتر میں دو کمرے ان کے لیے مخصوص کیے ہوئے ہیں۔ میرے یہ دونوں بیٹے چھوٹے ہی تھے جب میری بیوی کا انتقال ہوگیا۔ میں نے دوسری

نقشِ ماضی

شاکر لطیف

ماضی کے نقش بڑے جاندار اور پائیدار ہوتے ہیں۔ وقت کی گرد کے نیچے دب ضرور جاتے ہیں مگر مٹتے نہیں... ایک ایسی کہانی... جس کے کردار اپنے اپنے شعبے میں انتہائی ماہر سمجھے جاتے تھے آئندہ بہتر اور پُرسکون زندگی کے لیے انہیں اپنے فن کو خیرباد کہنا پڑا... لیکن وقت نے انہیں ایک بار پھر ماضی میں دھکیل دیا تھا...

گزرے دنوں کی سہانی یادگار دستک۔ ایک دلچسپ کہانی کے انوکھے موڑ

میں بڑے انہماک سے ٹی وی دیکھنے میں مگن تھا مگر میری بیوی کیتھی نے میرے سامنے موجود چھوٹی سی ٹیبل پر کافی کا کپ رکھا تو مجھے بھی مجبوراً اپنی محویت سے باہر نکلنا پڑا۔ کیتھی نے کافی کا یہ تیسرا کپ میری خدمت میں پیش کیا تھا۔ میں اچھی طرح جانتا تھا کہ اب وہ میرے لیے مزید کافی نہیں بنائے گی۔ مجھے ایک دن میں کافی کا جتنا کوٹا ملتا تھا، وہ پورا ہو گیا تھا۔

"یہ آخری کپ ہے۔" توقع کے مطابق اُس نے

اعلان بھی جاری کر دیا۔ "ویسے مزید کافی بھی مل سکتی ہے لیکن اگلے دن آج نہیں۔"

"ارے ڈارلنگ ایک تو تم ناراض بڑی جلدی ہو جاتی ہو۔" میں نے اسے پچکارتے ہوئے کہا۔ "دراصل ٹی وی پر فٹ بال کا میچ چل رہا ہے اور تم جانتی ہو مجھے فٹ بال کے میچ کا مزہ کافی کے بغیر نہیں آتا۔"

"آج کے دن تم نے جتنا مزہ کرنا تھا، کر لیا اس سے زیادہ کافی پینے کی میں تمہیں اجازت نہیں دوں گی۔" یہ کہتے ہوئے وہ اپنے کمرے کی جانب بڑھ گئی جبکہ میں نے مسکراتے ہوئے کافی کا کپ اٹھایا اور پھر کافی کی چسکیاں لیتے ہوئے دوبارہ فٹ بال میچ سے لطف اندوز ہونے لگا مگر اس بار بھی میرا انہماک زیادہ دیر تک قائم نہ رہ سکا کیونکہ کچھ ہی دیر میں کیتھی دوبارہ اپنے کمرے سے برآمد ہوگئی۔

اس کی برآمدگی پر میرے چہرے پر یک بہ یک ناگواری اور کراہیت کے تاثرات ابھر آئے۔ میری اس ناگواری کی وجہ میری حسین اور خوب صورت بیوی نہیں تھی بلکہ اس کے ہاتھوں میں موجود ایک چھوٹے سے آہنی شکنجے میں جکڑا ہوا وہ چوہا تھا جو شاید شکنجے میں پھنسنے کے بعد اپنی آخری سانسیں بھی لے چکا تھا۔ میری بیوی کیتھی چوہوں سے سخت الرجک تھی اور سے اپنے گھر میں ان کا وجود بالکل گوارا نہیں تھا اس لیے اس نے ان چوہوں کو مارنے کے لیے گھر میں جگہ جگہ یہ چوہے مار شکنجے لگا رکھے تھے۔ چوہا ان شکنجوں میں رکھے ہوئے کیک کے ٹکڑے کی جانب لپکتا اور پھر شکنجے میں پھنس کر اپنی زندگی سے ہمیشہ کے لیے ہاتھ دھو بیٹھتا۔ مجھے ویسے تو کیتھی کی طرح چوہوں سے کوئی خاص دشمنی نہیں تھی۔ تاہم اس وقت اس چوہے کے مردہ جسم اور منہ سے نکلنے والے خون کو دیکھ کر مجھے ابکائی سی آنے لگی تھی۔

"کیتھی، میں نے تمہیں کتنی بار کہا ہے کہ اپنی یہ چوہا مار مہم میری غیر موجودگی میں سرانجام دیا کرو۔" میں نے اپنی ابکائی اور متلی کی کیفیت پر قابو پاتے ہوئے ناگواری سے کہا۔

"پہلی بات تو یہ ہے کہ تم گھر سے بہت کم ہی غیر موجود ہوتے ہو۔" کیتھی نے تنک کر جواب دیا۔ "اور دوسری بات یہ ہے کہ چوہا کب اس شکنجے میں پھنسے گا، اس بات کی بھی کوئی گارنٹی نہیں ہے۔ ویسے اس بار میں نے ان چوہوں کا ایسا بندوبست کیا ہے کہ اس گھر سے ان کا ہمیشہ کے لیے صفایا ہو جائے گا۔"

"کیا تم پھر سے چوہے مار گولیاں لے آئی ہو؟" میں نے ہلکے غصے کے ساتھ کہا۔ "تم جانتی ہو پہلے بھی ان زہریلی گولیوں کی وجہ سے ہمیں کتنی مشکل پیش آئی تھی۔" میرا اعتراض بالکل بجا تھا۔ آج سے تقریباً ایک ماہ قبل کیتھی نے چاکلیٹ کے ذائقے والی زہریلی گولیوں کی مدد سے ان چوہوں کے خاتمے کی کوشش کی تھی۔ وہ مارکیٹ سے یہ گولیاں خرید کر لائی تھی اور پھر اس نے ان کو گھر کے ہر کونے کھدرے میں بکھیر دیا تھا۔ گولیوں نے واقعی میں اپنا کام دکھایا اور بہت سے چوہوں کا خاتمہ کر دیا مگر مسئلہ یہ تھا کہ چوہا ان چاکلیٹ سے بھرپور گولیوں کو کھانے کے فوراً بعد ہی ہلاک نہیں ہوتا تھا، اس کی ہلاکت کے لیے چند منٹ درکار ہوتے تھے اور ان چند منٹوں میں وہ گھر میں موجود کسی صوفے کے اندر یا کاٹھ کباڑ کے سامان کے پیچھے ایسی جگہ چھپ کر مرتا تھا جہاں سے اسے فوراً نکالنا مشکل ہو جاتا تھا۔

کیتھی کی لائی ہوئی گولیوں سے چوہوں کی ہلاکت تو ہوئی مگر پورے گھر میں بو اور تعفن بھی پھیل گیا جس کی وجہ سے مجھے اور کیتھی کو کئی دنوں تک گھر کے کونوں کھدروں سے مردہ چوہوں کو ڈھونڈ ڈھونڈ کر ٹھکانے لگانا پڑا۔ گولیوں کے فوائد اپنی جگہ کہ چوہے مارے جاتے تھے مگر گولیوں کے مضمرات فوائد سے کہیں زیادہ تھے۔ اس لیے اس کے بعد دوبارہ اس طریقے کو نہیں آزمایا گیا۔ تاہم آج کیتھی نے جب چوہوں کا کوئی نیا بندوبست کرنے کی بات کی تھی تو میں نے چونک کر اس سے سوال کر دیا تھا۔

"اس بار ایسا نہیں ہوگا۔" کیتھی نے گھر کا خارجی دروازہ کھولتے ہوئے جواب دیا۔ "اس بار میں نے ایسا بندوبست کیا ہے کہ چوہے ہلاک تو ہو جائیں گے مگر گھر کے اندر نہیں بلکہ گھر سے باہر جا کر۔" یہ کہتے ہوئے وہ دروازہ کھول کر باہر نکل گئی جبکہ میں دوبارہ فٹ بال میچ دیکھنے میں منہمک ہو گیا۔ میں جانتا تھا کہ کیتھی اس مردہ چوہے کو گھر سے کافی دور کسی کھائی میں پھینک کر آئے گی۔ اس لیے اس کی واپسی میں چند منٹ لگیں گے۔ اسے چوہوں سے ایسی دشمنی تھی کہ وہ ان کے مردہ جسموں کو بھی کافی دور پھینکتی تھی۔

میرا نام مارتھر ہے اور میں امریکا کے ایک خوب صورت اور پُرفضا علاقے الاسکا کا رہائشی ہوں۔ اس جگہ میں اپنی بیوی کیتھی اور اکلوتے بیٹے جونی کے ہمراہ پُرسکون زندگی بسر کر رہا تھا۔ میرے پاس دولت کی بھی کوئی کمی نہیں۔ اس لیے زندگی مزید سہل اور آسان ہو گئی تھی۔ میں اپنی بیوی کیتھی کے ہمراہ تقریباً گیارہ برس پہلے اس جگہ منتقل ہوا تھا۔ پہلی بار میں اور کیتھی ہنی مون منانے الاسکا آئے تھے اور پھر اس خوب صورت پہاڑی علاقے کے دلکش مناظر ہمیں اتنے

معاہدہ

تنویر ریاض

مستی و ترنگ میں بعض اوقات ایسے فعل سرزد ہو جاتے ہیں... جو بعد میں کسی واقعے کے رونما ہونے پر ندامت کا باعث ہی نہیں بلکہ قانون و انصاف کی پکڑمیں بھی آجاتے ہیں اپنے دل کے تاروں سے دوسروں کے دلوں میں اتر کے ہلچل مچا دینے والوں کا سلسلۂ واردات...

اچانک اٹھنے والی کیفیات کی لہروں کی نذر ہو جانے والے معاہدے کا انجام......

میرا خیال ہے کہ آخری بار کسی کو 1950ء میں لفافہ کھولنے والے چاقو سے ہلاک کیا گیا تھا لیکن یہ ایک پرانا تاریخی کالج ٹاؤن تھا جہاں ایک طرف تو سائنس اور فنون کے شعبوں میں اعلیٰ تعلیم کے مواقع میسر تھے تو دوسری جانب جرائم کی شرح نہ ہونے کے برابر تھی۔ یہ ان باقی ماندہ جگہوں میں سے ایک تھی جہاں لوگ اپنے گھروں میں تالا نہیں لگاتے تھے۔ محلوں میں چوکیداری کے لیے گارڈ نہیں تھے اور لوگ اپنی گاڑیوں میں چابی لگی چھوڑ کر چلے

جاتے تھے۔

جان رتھ فورڈ سے میری ملاقات کیمپس کے مغرب میں چھ بلاک کے فاصلے پر واقع دو منزلہ بنگلے کو جانے والے راستے پر ہوئی۔ یہ نوجوان سراغ رساں سارجنٹ جو حال ہی میں نیلوتی اسالٹ یونٹ میں آیا تھا۔ میری طرف بڑھا تو وہ کچھ ناراض لگ رہا تھا۔ گوکہ وہ مقامی تھا اور یہیں چند بلاک کے فاصلے پر پلا بڑھا تھا تاہم مجھے حیرانی تھی کہ کیا وہ مقتول کو جانتا ہے اور اس سے اس کی کچھ یادیں وابستہ ہیں یا اس سے کوئی لگاؤ تھا۔

جب رتھ فورڈ وہاں پہنچا تو اس نے سڑک پر سات پٹرول کاریں دیکھیں۔ کئی پولیس والے لان اور پورچ میں پھر رہے تھے اور فٹ پاتھ پر کھڑے راہ گیر منہ ہی منہ میں بڑبڑا رہے تھے۔ ان میں سے زیادہ تر لاش کو دیکھنے آئے تھے۔ اسی طرح بہت سے پولیس والوں نے شاید پہلی بار اپنے کیریئر میں کوئی قتل ہوتے دیکھا ہو۔ اب مجھے رتھ فورڈ کی ناراضی کی وجہ سمجھ میں آگئی لیکن یہ شکایت کرنے کے لیے مناسب وقت نہیں تھا۔

میں نے اپنا ہاتھ اٹھاتے ہوئے کہا۔ ''مجھے بعد میں بتانا۔''

''لیکن......''

جو نقصان ہونا تھا وہ ہو چکا۔ یہ کیوں ہوا، کیسے ہوا۔ اس پر بعد میں بھی بات ہوسکتی تھی۔ لوگوں کے سامنے پولیس والوں پر تنقید کرنے سے کچھ حاصل نہ ہوتا جبکہ وہاں ایک ٹی وی چینل کی وین بھی آگئی تھی۔ رتھ فورڈ نے ایک گہری سانس لیتے ہوئے کہا۔ ''مقتول رابرٹ اِرون ایک ریٹائرڈ اکنامکس پروفیسر تھا۔ عمراً کہتر سال۔ موت کی وجہ وہی ہے جو فون پر بتائی گئی۔ اس کی پشت پر بائیں پہلو کی جانب لفافہ کھولنے والے چاقو سے کاری زخم لگایا گیا۔''

مجھے دیکھ کر وہاں موجود پولیس والوں نے وہ تمام کام شروع کردیے جو انہیں اپنی آمد کے فوراً بعد کرنے چاہیے تھے۔ مثلاً مجمع کو کنٹرول کرنا، جائے وقوعہ کے گرد زرد فیتہ باندھنا اور گاڑیوں کے نمبر نوٹ کرنا وغیرہ گوکہ میری عمر صرف باون سال تھی لیکن میں ان سب میں عمر رسیدہ تھا اور حال ہی میں تیس سال خدمات انجام دینے کے بعد فلاڈیلفیا پولیس ڈپارٹمنٹ سے ریٹائر ہوا تھا اور اب میں نے اس قصبے کے چھوٹے سے سراغ رسانی کے شعبے میں کیپٹن کی ذمے داری سنبھال لی تھی۔ ڈپارٹمنٹ کا ہر افسر مجھے متاثر کرنے کی کوشش میں لگا رہتا تھا صرف یہ ثابت کرنے کے لیے کہ میرے آنے کے بعد پولیس ڈپارٹمنٹ پہلے سے زیادہ فعال ہوگیا ہے۔

ڈپارٹمنٹ کے دو کرائم سین ٹیکنیشنز آئے اور ہم چاروں ایک ساتھ سیڑھیاں چڑھتے ہوئے اوپر گئے۔ میں اور رتھ فورڈ، پروفیسر کے ہوم آفس کے دروازے پر کھڑے ہوکر انتظار کرنے لگے جبکہ ٹیکنیشنز نے جائے وقوعہ کی تصویریں اور ویڈیوز بنانا شروع کردیں۔ ہم نے لاش کا معائنہ کیا جو میز اور کرسی کے پیچھے کھڑکی کے متوازی پڑی ہوئی تھی۔ اِرون کروٹ کے بل لیٹا ہوا تھا اور ہمیں اس کی پسلیوں کے درمیان چاقو کا دستہ باہر نکلا ہوا نظر آرہا تھا اور کافی سے زیادہ خون قالین میں جذب ہو چکا تھا جس کا مطلب تھا کہ پروفیسر کی موت زیادہ خون بہہ جانے کی وجہ سے ہوئی ہے۔ رتھ فورڈ نے کرسی کی طرف اشارہ کیا۔ اسے میز سے پیچھے کی جانب کھینچا گیا تھا اور اس کا رخ دائیں جانب تھا۔ ''ایسا لگتا ہے کہ کوئی اندر آیا۔ اسے دیکھ کر اِرون کھڑا ہوگیا۔ قاتل میز کے قریب آیا اور اس نے چاقو اٹھا لیا۔ اِرون نے اس سے بچنا چاہا تو قاتل نے وہ چاقو اس کے پہلو میں گھونپ دیا۔

اس سے میں نے یہ نتیجہ اخذ کیا کہ قاتل دفتر میں اس ہتھیار کی موجودگی کے بارے میں جانتا تھا یا وہ اسے قتل کرنے کے ارادے سے نہیں آیا تھا۔

''تم یقین سے کہہ سکتے ہو کہ جب ہنگامی طبی امداد کا عملہ یہاں پہنچا تو یہ کرسی اسی پوزیشن میں تھی؟''

وہ اثبات میں سر ہلاتے ہوئے بولا۔ ''وہ سب سے پہلے جائے وقوعہ پر پہنچے اور انہوں نے لاش کا معائنہ کرنے سے پہلے اس کی ایک تصویر بھی لی تھی۔''

''اس کی موت کب واقع ہوئی؟''

''گزشتہ چند گھنٹوں میں، ہم کہہ سکتے ہیں کہ صبح نو اور دوپہر کے درمیان۔''

''کوئی گواہ؟''

''ابھی تک کوئی نہیں۔ پٹرول سارجنٹ کے آدمی پڑوسیوں اور اہلِ محلہ سے پوچھ گچھ کررہے ہیں۔ اس کے بعد ہی وہ ہمیں کچھ بتا سکے گا۔'' وہ لمحہ بھر کے لیے رکا پھر کہنے لگا۔ ''اس عمارت میں کوئی خفیہ کیمرا نصب نہیں ہے اور نہ ہی کوئی گھر میں زبردستی داخل ہوا۔ لیکن قصبے کے دوسرے لوگوں کی طرح اس گھر کے دروازے بھی مقفل نہیں ہوتے۔''

''بیوی بچے؟'' میں نے سوال کیا۔

چور چوکیدار

جمال دستی

کام زندگی کا حصہ ہیں... روزمرہ کے امور نمٹانے میں شب و روز تیزی سے گزر جاتے ہیں... مصروفیت زیادہ ہونے کی صورت میں بعض اوقات کاموں کی انجام دہی میں عجلت سے بھی کام لینا پڑتا ہے... ایک محکمے سے متعلق مختلف لوگوں کی ذمّے داریاں... وہ لوگ اپنے کام میں مسلسل جُتے ہوئے تھے... مگر ایک دن ایسا آیا کہ ان کا کام ہی ان کی راہ میں آڑے آگیا...

چوری اور سینہ زوری کرنے والوں کا پیچیدہ احوال

کیون ڈیوڈ حسبِ معمول ایک کتاب کے مطالعے میں مصروف تھا کہ ٹیلی فون کی گھنٹی بجی۔ اس کی آواز سنتے ہی اس کی بیٹی ایشلے کمرے سے باہر چلی گئی جس کا مطلب تھا کہ وہ فون سننا نہیں چاہتی۔ اصولی طور پر وہ اس کے خلاف تھا کہ وہ فون کرنے والے سے یہ کہے کہ ایشلے گھر پر نہیں ہے لیکن وہ اپنی بیٹی کی مرضی کے خلاف کچھ نہیں کرنا چاہتا تھا۔ اسے معلوم تھا کہ فون کرنے والا کوئی ایسا شخص ہے جس کے پاس ایشلے کا سیل نمبر نہیں ہے اور وہ ان لوگوں میں

سے نہیں جن سے وہ رابطے میں رہتی ہے۔
فون کرنے والی کوئی لڑکی تھی جب اسے معلوم ہوا کہ ایشلے گھر پر نہیں ہے تو وہ بولی۔
''کیا تم اسے بتادو گے کہ فلپ بیلڈوز نے خودکشی کر لی ہے۔'' یہ کہہ کر اس نے فون بند کر دیا۔
وہ نہیں جانتا تھا کہ مرنے والا کوئی راک اسٹار ہے یا فلم اسٹار۔ اس قسم کے واقعات آئے دن ہوتے رہتے ہیں۔ ممکن ہے کہ اس نے زیادہ مقدار میں ہیروئن لے لی ہو۔ جب ایشلے واپس آئی تو اس نے یہ پیغام اس تک پہنچا دیا۔ یہ سنتے ہی وہ بے اختیار چلا اٹھی۔ ''ماں! ماں!''
بہت جلد ڈیوڈ کو معلوم ہو گیا کہ مرنے والا کوئی مشہور شخصیت نہیں بلکہ ڈورتھی پارکر ہائی اسکول کا فیکلٹی ممبر تھا جہاں ایشلے پڑھ رہی تھی۔ اس کی موت ایشلے کی ماں کو بھی افسردہ کر گئی جو کاؤنٹی میں کورونر کے فرائض انجام دے رہی تھی۔ ان دونوں کے درمیان ہونے والی گفتگو سے ڈیوڈ کو معلوم ہوا۔ بیلڈوز ایک مقبول ٹیچر، فٹ بال ٹیم کا کوچ اور اسسٹنٹ ڈین آف ڈسپلن تھا۔ تمام لڑکیاں اس کی عزت کرتی تھیں اور لڑکے اس سے گھبراتے تھے کیونکہ وہ انہیں ڈسپلن کی خلاف ورزی کا کوئی موقع نہیں دیتا تھا۔

چند منٹوں میں یہ خبر آگ کی طرح پھیل گئی اور جب سراغ رساں لیفٹیننٹ ڈوئل نے باضابطہ طور پر میری کو اس کی موت کے بارے میں آگاہ کیا۔ اس وقت تک ایشلے کو اس کے پانچ جاننے والوں کے پیغامات یا فون کالز آ چکی تھیں۔ اپنی عادت کے برعکس اس نے ماں کے منع کرنے پر اس کے ساتھ جائے وقوعہ پر جانے کے لیے اصرار نہیں کیا۔

میری جب ہائی اسکول پہنچی تو وہاں ڈرائیو وے اور پک اپ لین پر درجنوں گاڑیاں کھڑی تھیں اور اسکول کے احاطے میں کئی طالب علم اور ان کے والدین یہ دردناک منظر دیکھنے کے لیے موجود تھے۔ میری نے کوشش کر کے اپنی گاڑی عمارت کے قریب کھڑی کی اور ایک بغلی دروازے سے اندر چلی گئی جس کے باہر دو پولیس گاڑیاں، ایک ایمبولینس اور ایک فائر اینڈ ریسکیو وین کھڑی ہوئی تھی۔ اس کے علاوہ ٹی وی کا عملہ کیمرے سمیت موجود تھا لیکن وہ اسے پہچان نہ سکے۔
سراغ رساں ڈوئل اسے دروازے پر ہی مل گیا۔ اس نے میری کا سیاہ بیگ پکڑا، اور اسے لے کر لاکرز کی قطاروں کے درمیان بنی ہوئی راہداری کی جانب چل دیا۔
وہ جم کے پاس سے گزرے جہاں اس وقت اندھیرا تھا۔ اس سے آگے پولیس ٹیکنیشن راجر ٹریڈوائن ایک دروازے پر جھکا ہوا کھڑا تھا۔ وہ مردوں کا لاکر روم تھا۔ اندر دو آدمی خاموش کھڑے ہوئے تھے۔ ان کی کوشش تھی کہ زمین پر جو چیز پڑی ہوئی ہے، اس کی طرف نہ دیکھیں۔
وہ پندرہ ضرب بیس کا کمرا تھا۔ وہاں دونوں جانب آٹھ لاکرز تھے۔ درمیان میں خالی جگہ پر صرف دو لکڑی کی بنچیں تھیں اور کمرے کے آخری سرے پر ریسٹ روم اور شاور تھا۔ عام لباس پہنے ہوئے ایک جوان شخص بنچ کے قریب چت لیٹا ہوا تھا۔ اس کی دائیں کنپٹی پر گولی کا زخم تھا جو اس کی موت کا سبب بنا۔ ان میں سے ایک لاکر کا دروازہ کھلا ہوا تھا اور اس میں کسی آدمی کی جیکٹ، کچھ کتابیں اور کاغذات اندر رکھے ہوئے نظر آرہے تھے۔ فرش پر درجنوں گولیاں بکھری پڑی ہوئی تھیں۔ ان میں کچھ سفید اور کچھ زرد رنگ کی تھیں۔
''مجھے پستول مل گیا ہے۔'' ٹریڈوائن نے میری کو بتایا۔ ''اور دو درجن تصویریں بھی لے لی ہیں۔''
''اس کمرے میں پرنسپل نیول بوائڈ اور کسٹوڈین کول ولسن بھی موجود تھے۔ کسٹوڈین نے بتایا کہ وہ معمول کے مطابق اتوار کی سہ پہر ساڑھے تین بجے راؤنڈ پر تھا۔ وہ یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ اس کمرے کے دروازے اندر سے مقفل تھے جبکہ ان میں کوئی تالا نہیں ہے۔ اس نے دروازے کی درز میں ٹارچ کی روشنی ڈالی اور دیکھا کہ ایک لوہے کا تار دونوں دروازوں کے ہینڈل کے گرد لپٹا ہوا ہے اور اس میں ایک پیڈلاک لگا دیا گیا ہے۔ وہ سمجھا کہ یہ کوئی نقب زنی کی واردات نہیں ہے بلکہ کسی نے مذاق کیا ہے۔ اس نے فون پر ڈاکٹر بوائڈ کو اطلاع دی جس نے کہا کہ وہ باہر جا کر لاکر روم کا ایمرجنسی دروازہ چیک کرے۔
ولسن نے دیکھا کہ وہ دروازہ بند اور مقفل تھا۔ اس وقت تک بوائڈ بھی وہاں پہنچ چکا تھا لیکن اسے دروازہ کھولنے کے لیے چابی نہیں ملی تاہم انہوں نے فائر ڈپارٹمنٹ یا پولیس کو بلانا ضروری نہیں سمجھا بلکہ ولسن نے دروازوں کی درمیانی جگہ سے ایک چھوٹی آری داخل کر کے تار کو کاٹ دیا۔ لاکر روم میں داخل ہونے کے بعد انہوں نے جو کچھ دیکھا، اس کے بعد ریسکیو کا عملہ اور پولیس کو بلانا ضروری ہو گیا۔

سزا

اعتزاز سلیم وصلی

خواہشات کے مارے افراد بنا محنت کے وہ سب حاصل کرنا چاہتے ہیں جو دوسروں نے اپنی اَن تھک محنت سے بنایا ہوتا ہے... دولت کی بڑھتی ہوئی ہوس نے انہیں اندھا کردیا تھا... اعتبار اعتماد کے رشتوں کو داغ دار کردینے والے اعمال کا شاخسانہ...

سزا و جزا کے ترازو میں ڈولتی کہانی کے حقائق

فیصل آباد کے کسی دیہی علاقے سے آنے والے میاں شاکر علی کے بارے میں مشہور تھا کہ وہ جس کام میں ہاتھ ڈالے، اسے انتہا پر لے کر جاتا ہے۔ جوانی میں شاید شاکر کا چہرہ خوبصورت رہا ہوگا مگر پینتالیس کا ہندسہ عبور کرتے ہی اس کے نقوش پر بڑھاپے کے اثرات تیزی سے نمایاں ہونے لگے۔ اب شاکر نیند میں بھی ایسا محسوس ہوتا جیسے کچھ سوچ رہا ہے۔ معصومیت نام کے لفظ سے اس کا چہرہ ناواقف تھا۔ اسے غور سے دیکھنے والے ہر شخص کے دماغ میں پہلی بات یہی جاتی

ہو گی کہ اس سے بچ کر رہنا چاہیے ورنہ کیا پتا سیدھا ہاتھ دکھا کر الٹا مار دے۔ یہ بات سچ بھی تھی۔ شاکر ہر اس موقع سے فائدہ اٹھاتا تھا جو اس کی دولت بڑھانے میں اس کی مدد کر سکتا۔ وہ ان لوگوں میں سے تھا جن کے لیے دولت بس دولت ہے اور حرام حلال کی تمیز کم از کم دولت کے معاملے میں کرنا بے وقوفی ہے۔ اس وقت بھی وہ اپنے بیڈروم میں آرام دہ بیڈ پر لیٹا کیلکولیٹر ہاتھ میں لیے حساب کرنے میں مصروف تھا جب اس کی بیٹی رابعہ کمرے میں داخل ہوئی۔ ”ڈیڈ۔“

”جی بیٹا۔“

”آپ نے کہا تھا امتحانات کے بعد مجھے ٹرپ پر جانے دیں گے لیکن اب مما نے اجازت دینے سے انکار کر دیا ہے۔“

”مما کی آپ نے کونسا ماننی ہے بیٹا؟“ وہ مسکرا کر بولا۔

”ڈیڈ......“ اس نے ناراض نظروں سے باپ کی طرف دیکھا۔

”اچھا میں لے دوں گا اجازت۔ اب خوش؟“ شاکر نے ہاتھ بڑھا کر اس کے بال بکھیر دیے۔ وہ مسکرا دی۔

”آپ اس دنیا کے سب سے اچھے ڈیڈ ہیں۔“

”مجھے معلوم ہے۔“ وہ ہنسا۔ رابعہ باہر چلی گئی۔ ابھی اُسے گئے بیس منٹ ہوئے تھے کہ عابدہ اندر داخل ہوئی۔ وہ تقریباً چالیس سال کی ایک قبول صورت عورت تھی۔

”شاکر یہ رابعہ نے اب کیا نئی ضد پکڑی ہوئی ہے؟“

”کونسی ضد؟“

”یہی ٹرپ پر جانے والی؟ آج کل حالات کا علم تو آپ کو ہے ہی...... میں نے تو بہانہ بنا دیا تھا کہ اگلے سال سب چلیں گے لیکن وہ مانتی ہی نہیں۔“

”چلو، کر لینے دو اُسے شوق پورا۔ پہلے بھی تو جاتی تھی۔“

”پہلے کی بات اور تھی شاکر، اب وہ جوان ہو رہی ہے۔ آپ کو تو فکر ہی نہیں اولاد کی۔ آپ نے ہی بگاڑ رکھا ہے۔“

”ان کی عمر ہے ان کاموں کی۔ تم فکر نہ کرو میں رابعہ کو سمجھا دوں گا، محتاط رہے گی۔“ اس نے ہاتھ بڑھا کر بیوی کا گال تھپتھپایا۔ اس کے جانے کے بعد شاکر نے گہری سانس لی۔ ”سب کے لیے پیسے بھی کماؤں، ان کے مسائل بھی حل کروں اور سب کو سمجھاؤں بھی۔ واہ شاکر تیری بھی کیا زندگی ہے۔“ وہ بڑبڑایا۔ کچھ دیر سوچنے کے بعد موبائل اٹھا کر اس نے نمبر ملایا۔ دوسری طرف سے کسی کی آواز سنائی دی۔

”شاکر...... کتنے دنوں بعد یاد کیا ہے۔“ بولنے والی خوشگوار موڈ میں تھی یا شاکر کا نمبر دیکھ کر خوش ہو گئی تھی۔

”یاد تو انہیں کیا جاتا ہے سویٹ ہارٹ جو بھول جائیں۔ آپ تو ہمارے دل میں رہتی ہیں۔“ اس وقت وہ کہیں سے بھی میچور شخص نہیں لگ رہا تھا۔ اس کا انداز کالج کے کسی منچلے طالب علم جیسا تھا۔

”تو آج آ جائیں ناں۔“ آواز میں مخصوص قسم کی کشش پیدا کر کے کہا گیا تو شاکر کا دل مچل اٹھا۔

”آج رات...... دس بجے...... تمہارے فلیٹ پر۔“

☆☆☆

”کیا تم سب تیار ہو؟“ ویرانے میں آواز گونجتی ہوئی محسوس ہوئی۔ اس ادھیڑ عمر، گنجے سر اور مضبوط جسامت کے مالک شخص کے سامنے اس وقت پانچ لڑکے موجود تھے۔ ان سب کی عمر اٹھارہ سے بائیس سال کے درمیان تھی۔

”یس سر۔“ ویرانہ دوبارہ آواز سے گونج اٹھا۔

”تو پھر جاؤ۔“ اس نے قطار میں کھڑے سب سے پہلے لڑکے کو دھکا دیا۔ وہ سب بھاگ پڑے۔ ایک ڈھلوان سے کود کر وہ نیچے پھسلتے چلے گئے۔ ڈھلوان سے نیچے پانی بہہ رہا تھا۔ صاف شفاف پانی میں ان پانچوں کے کودنے کی آواز صاف سنائی دی۔ گنجے سر والا اوپر کھڑا دوربین سے ان سب کو دیکھ رہا تھا۔ وہ پانی میں کسی ماہر کی طرح تیر رہے تھے۔ تھوڑا آگے جانے کے بعد وہ پانی سے باہر نکلے۔ یہاں ایک صندوق میں بھاری اسلحہ موجود تھا۔ سب نے اپنی اپنی پسند کی رائفلیں اٹھائیں اور سامنے موجود درختوں کو نشانہ بنانے لگے۔

”شاباش، ویلڈن!“ وہ ان لڑکوں کی مہارت دیکھ کر بڑبڑایا۔ پچھلے دس ماہ کی لگاتار محنت کے بعد یہ گروپ اب تیار ہو چکا تھا۔ یہ اس کا تیسرا گروپ تھا اور اس کی کامیابی کا اسے یقین تھا۔ تقریباً ایک گھنٹے بعد وہ ان سب کو لیے اس ڈبل کیبن میں واپس جا رہا تھا جس میں وہ یہاں آئے تھے۔ اس بار ان کی منزل ایک فارم ہاؤس تھا جہاں سخت سیکیورٹی کا انتظام تھا۔ دلچسپ بات یہ تھی کہ ایک کمپیوٹر آپریٹر کو چھوڑ کر اس پوری سیکیورٹی میں کوئی انسانی وجود نہیں تھا۔ یہاں تک کہ فارم ہاؤس کے گیٹ پر بھی سیکیورٹی گارڈ موجود نہ تھے۔ گنجے سر کے مالک اس شخص جسے سب باس کہہ کر مخاطب کرتے تھے، نے نیچے اتر کر گیٹ کے مخصوص ڈیجیٹل لاک پر کوڈ ملایا جس کے بعد گیٹ خود بخود کھل گیا۔ یہ کوڈ اگر دو بار غلط ملایا جاتا تو پورے فارم ہاؤس میں خطرے کا الارم بج سکتا تھا۔ وہ ان سب کو لے کر ایک خاص کمرے کی طرف بڑھ گیا۔ یہاں پروجیکٹر لگا ہوا تھا۔ اس نے پروجیکٹر کے ساتھ کمپیوٹر اٹیچ کیا۔ پانچوں لڑکے

آوارہ گرد

ڈاکٹر عبدالرب بھٹی

قسط 65

مندر، کلیسا، سینی گاگ، دھرم شالے اور اناتھ آشرم... سب ہی اپنے اپنے عقیدے کے مطابق بہت نیک نیتی سے بنائے جاتے ہیں لیکن جب بانیوں کے بعد نکیل بگڑے ذہن والوں کے ہاتھ آتی ہے تو سب کچھ بدل جاتا ہے... محترم پوپ پال نے کلیسا کے نام نہاد راہبوں کو جیسے گھناؤنے الزامات میں نکالا ہے، ان کا ذکر بھی شرمناک ہے مگر یہ ہو رہا ہے... استحصال کی صورت کوئی بھی ہو، قابل نفرت ہے... اسے بھی وقت اور حالات کے دھارے نے ایک فلاحی ادارے کی پناہ میں پہنچا دیا تھا... سکھ رہا مگر کچھ دن، پھر وہ ہونے لگا جو نہیں ہونا چاہیے تھا... وہ بھی مٹی کا پتلا نہیں تھا جوان کا شکار ہو جاتا... وہ اپنی چالیں چلتے رہے، یہ اپنی گھات لگا کر ان کو نیچا دکھاتا رہا... یہ کھیل اسی وقت تک رہا جب اس کے بازو توانا نہ ہو گئے اور پھر اس نے سب کچھ ہی الٹ کر رکھ دیا... اپنی راہ میں آنے والوں کو خاک چٹا کر اس نے دکھا دیا کہ طاقت کے گھمنڈ میں راج کا خواب دیکھنے والوں سے برتر... بہت برتر قوت وہ ہے جو بے آسرا نظر آنے والوں کو نمرود کے دماغ کا مچھر بنا دیتی ہے... پل پل رنگ بدلتی، نئے رنگ کی سنسنی خیز اور رنگا رنگ داستان جس میں سطر سطر دلچسپی ہے...

تحیر... سنسنی اور ایکشن میں ابھرتا ڈوبتا دلچسپ سلسلہ...

شہزاد احمد خان شہزی نے ہوش سنبھالا تو اسے اپنی ماں کی ایک ہلکی سی جھلک یاد تھی۔ باپ، سوتیلی ماں کے کہنے پر اسے اطفال گھر چھوڑ گیا جو یتیم خانے کی ایک جدید شکل تھی جہاں بوڑھے بچے سب ہی رہتے تھے۔ ان میں ایک لڑکی عابدہ بھی تھی، شہزی کو اس سے انسیت ہوگئی۔ شہزی کی دوستی وہاں ایک بوڑھے سرمد بابا سے ہوگئی جن کی حقیقت جان کر شہزی کو بے حد حیرت ہوئی کیونکہ وہ بوڑھا لاوارث نہیں بلکہ ایک کروڑ پتی شخص تھا۔ اس کے اکلوتے بیٹے نے اپنی بیوی کے کہنے پر سب کچھ اپنے نام کروا کر اسے اطفال گھر میں پھینک دیا تھا۔ اطفال گھر پر رفتہ رفتہ جرائم پیشہ عناصر کا عمل دخل بڑھنے لگتا ہے۔ شہزی کا ایک دوست اول خیر چوہدری ممتاز خان کے حریف گروپ جس کی سربراہ ایک جوان خاتون زہرہ بیگم ہے، سے تعلق رکھتا تھا۔ وہاں وہ چھوٹے استاد کے نام سے جانا جاتا تھا۔ بڑا استاد کبیل دادا ہے جو زہرہ بانو کا خاص دستِ راست اور اس کا یکطرفہ چاہنے والا بھی تھا۔ زہرہ بانو درحقیقت ممتاز خان کی سوتیلی بہن ہے۔ دونوں بھائی بہنوں کے بیچ زمین کا تنازع عرصے سے چل رہا تھا۔ کبیل دادا، شہزی سے خار کھانے لگتا ہے۔ اس کی وجہ زہرہ بانو کا شہزی کی طرف خاص التفات ہے۔ بیگم صاحبہ کے حریف، چوہدری ممتاز خان کو شہزی ہر محاذ پر شکست دیتا چلا آرہا تھا، زہرہ بانو، لئیق شاہ نامی ایک نوجوان سے محبت کرتی تھی جو درحقیقت شہزی کا ہم شکل ہی نہیں، اس کا بچھڑا ہوا بھائی تھا۔ شہزی کی جنگ پھیلتے پھیلتے ملک دشمن عناصر تک پہنچ جاتی ہے۔ ساتھ ہی شہزی کو اپنے ماں باپ کی بھی تلاش تھی۔ وزیر جان جو اس کا سوتیلا باپ ہے، اس کی جان کا دشمن بن جاتا ہے۔ وہ ایک جرائم پیشہ گینگ ''اسپیکٹرم'' کا زونل چیف تھا، جبکہ چوہدری ممتاز خان اس کا حلیف۔ رینجرز فورس کے میجر ریاض ان ملک دشمن عناصر کی کھوج میں تھے لیکن دشمنوں کو سیاسی اور عوامی حمایت حاصل تھی۔ لوہے کو لوہے سے کاٹنے کے لیے شہزی کو اعزازی طور پر بھرتی کرلیا جاتا ہے اور اس کی تربیت بھی پاور کے ایک خاص تربیتی کیمپ میں شروع ہوجاتی ہے، عارفہ علاج کے سلسلے میں امریکا جاتے ہوئے عابدہ کو اپنے ساتھ لے جاتی ہے۔ اسپیکٹرم کا سربراہ لولوش، شہزی کا دشمن بن چکا ہے، وہ جے بی سی (جیوش بزنس کمیونٹی) کی ملی بھگت سے عابدہ کو امریکی سی آئی اے کے چنگل میں پھنسا دیتا ہے۔ اس سازش میں بالواسطہ عارفہ بھی شریک ہوتی ہے۔ باسکل ہولارڈ، ایک یہودی نژاد کٹر مسلم دشمن اور جے بی سی کے خفیہ دنیائے مسلم کے خلاف سازشوں میں ان کا دستِ راست ہے۔ باسکل ہولارڈ کی فورس ٹائیگر ٹیگ شہزی کے پیچھے لگ جاتی ہے۔ باسکل ہولارڈ کی لاڈلی بیٹی انجیلا، لولوش کی بیوی ہے۔ اڈیسہ کمپنی کے شیئرز کے سلسلے میں عارفہ اور سرمد بابا کے درمیان چپقلش آخری نہج پر پہنچ جاتی ہے، جسے لولوش اپنی ملکیت سمجھتا ہے، ایک نودولتیا سیٹھ نوید سانچے والا مذکورہ شیئرز کے سلسلے میں ایک طرف تو لولوش کا ناوٗٹ ہے اور دوسری طرف وہ عارفہ سے شادی کا خواہش مند ہے۔ اس دوران شہزی اپنے ماں باپ کو تلاش کرنے میں کامیاب ہوجاتا ہے۔ اس کا باپ تاج دین شاہ، درحقیقت وطن عزیز کا ایک گمنام بہادر غازی سپاہی تھا۔ وہ بھارت کی خفیہ ایجنسی کی قید میں تھا۔ بھارتی خفیہ ایجنسی بلیوٹمسی کا ایک افسر کرنل سی جی بھجوانی، شہزی کا خاص ٹارگٹ ہے۔ شہزی کے ہاتھوں بیک وقت اسپیکٹرم اور بلیوٹمسی کو ذلت آمیز شکست ہوتی ہے اور وہ دونوں آپس میں خفیہ گٹھ جوڑ کرلیتے ہیں۔ شہزی، کبیل دادا اور زہرہ بانو کی شادی کرنے کی بات چلانے کی کوشش کرتا ہے جس کے نتیجے میں کبیل دادا کا شہزی سے نہ صرف دل صاف ہوجاتا ہے بلکہ وہ بھی اول خیر کی طرح اس کی دوستی کا دم بھرنے لگتا ہے۔ باسکل ہولارڈ، امریکا میں عابدہ کا کیس دہشت گردی کی عدالت میں منتقل کرنے کی سازش میں کامیاب ہوجاتا ہے۔ امریکا میں مقیم ایک بین الاقوامی مبصر اور رپورٹر آنسہ خالدہ، عابدہ کے سلسلے میں شہزی کی مدد کرتی ہے۔ وہی شہزی کو مطلع کرتی ہے کہ باسکل ہولارڈ، سی آئی اے میں ٹائیگر ٹیگ کے دو ایجنٹ اس کو اغوا کرنے کے لیے خفیہ طور پر امریکا سے پاکستان روانہ کرنے والا ہے۔ شہزی ان کے شکنجے میں آجاتا ہے، ٹائیگر ٹیگ کے مذکورہ دونوں ایجنٹ اسے پاکستان سے نکالنے کی کوشش کرتے ہیں۔ جہاز راں کمپنی اڈیسہ کے شیئرز کے سلسلے میں لولوش برما (رنگون) میں مقیم تھا۔ اس کا دستِ راست سے جی کوہارا، شہزی کو ٹائیگر ٹیگ سے چھین لیتا ہے اور اپنی ایک لگژری بوٹ میں قیدی بنالیتا ہے۔ وہاں اس کی ملاقات ایک اور قیدی، بشام چھلکری سے ہوتی ہے جو کبھی اسپیکٹرم کا ایک ریسرچ آفیسر تھا جو بعد میں تنظیم سے کٹ کر اپنے بیوی بچوں کے ساتھ روپوشی کی زندگی گزار رہا تھا۔ بشام اسے پاکستان میں موئن جودڑو سے برآمد ہونے والے طلسمِ نور ہیرے کے راز سے آگاہ کرتا ہے جو چوری ہوچکا ہے اور لولوش اور سی جی بھجوانی کے ایک مشترکہ معاہدے کے تحت سے جی کوہارا کی بوٹ میں بلیوٹمسی کے چندر ناتھ، شیام اور کوریلا آتے ہیں۔ وہ شہزی کو آنکھوں پٹی باندھ کر بلیوٹمسی کے ہیڈ کوارٹر لے جاتے ہیں، وہاں پہلی بار بلیوٹمسی کے چیف سی جی بھجوانی کو شہزی اپنی نظروں کے سامنے دیکھتا ہے، کیونکہ یہ وہی درندہ صفت شخص تھا جس نے اس کے باپ پر اس قدر تشدد کے پہاڑ توڑے تھے کہ وہ اپنی یادداشت کھو بیٹھا تھا۔ اب پاکستان میں شہزی کے باپ کی حیثیت ڈکلیئر ہوگئی تھی کہ وہ ایک محبِ وطن گمنام سپاہی تھا، تاج دین شاہ کو ایک تقریب میں اعلیٰ فوجی اعزاز سے نوازا جاتا ہے۔ اس لحاظ سے شہزی کی اہمیت بھی کم نہ تھی، یوں بھجوانی اپنے منصوبے کے مطابق اس کی رہائی کے بدلے پاکستان میں گرفتار شدہ اپنے جاسوس سندر داس کو آزاد کروانا چاہتا تھا۔ ایک موقع پر شہزی، اس بری قصاب، سے جی کوہارا اور اس کے ساتھی بھومک کو بے بس کردیتا ہے، وہاں سوشیلا کے ایل ایڈوانی سے اپنی بہن، بہنوئی اور اس کے دو معصوم بچوں کے قتل کا انتقام لینے کے لیے شہزی کی ساتھی بن جاتی ہے۔ دونوں ایک خونی معرکے کے بعد وہاں سے فرار ہوجاتے ہیں۔ پولیس ان دونوں کے تعاقب میں تھی مگر شہزی اور سوشی کا سفر جاری رہتا ہے۔ حالات کی مستقل پُرفریبیوں کے باوجود وہ اس چھوٹی سی بستی میں تھے کہ کوہارا اور چندر ناتھ حملہ کردیتے ہیں۔ خونی معرکے کے بعد شہزی اور سوشیلا وہاں سے نکلنے میں کامیاب ہوجاتے ہیں۔ شہزی کا پہلا ٹارگٹ صرف سی جی بھجوانی تھا۔ ممبئی ان کی منزل تھی۔ موہن اور ان دونوں کو ایک ریسٹورنٹ میں ملنا تھا مگر اس کی آمد سے پہلے ہی وہاں ایک ہنگامہ ان کا منتظر تھا۔ کچھ لوفر ٹائپ لڑکے ایک رینا نامی لڑکی کو تنگ کررہے تھے۔ شہزی کافی دیر سے یہ برداشت کررہا تھا۔ بالآخر اس کا خون جوش میں آیا اور ان غنڈوں کی اچھی خاصی مرمت کرڈالی۔ رینا اس کی مشکور تھی۔ اسی اثنا میں رینا کے باڈی گارڈ وہاں آجاتے ہیں اور یہ روح فرسا انکشاف ہوتا ہے کہ وہ کے ایل ایڈوانی کی پوتی ہے۔ ان کے ساتھ آسمان سے گرے کھجور میں اٹکنے والا معاملہ تھا۔ شہزی، رینا کو اپنے پاکستانی ہونے اور اپنے مقاصد کے بارے میں بتا کر قائل کرنے میں کامیاب ہوجاتا ہے۔ رینا، شہزی کی مدد کرتی ہے اور وہ اپنے ٹارگٹ بلیوٹمسی تک پہنچ جاتا ہے۔ پھر وہاں کی سیکیورٹی سے مقابلے کے بعد بلیوٹمسی کے ہیڈ کوارٹر میں تباہی مچا دیتا ہے اور سی جی بھجوانی کو اپنی گرفت میں لے لیتا ہے۔ شہزی نے ایک بوڑھے کا روپ دھارا ہوا تھا۔ سی جی بھجوانی، شہزی کے گن کے نشانے پر تھا مگر اسے

مار نہیں سکتا کہ شہزی کے ساتھی اول خیر، شکیلہ اور کمبیل دادا اس کے قبضے میں تھے اور کالا پانی ''انڈیمان'' پہنچا دیے گئے تھے۔ کالا پانی کا نام سن کر شہزی گنگ رہ جاتا ہے کیونکہ وہاں جانا ناممکنات میں سے تھا۔ اپنے ساتھیوں کی رہائی کے لیے سی جی بھوانی کو ٹارچر کرتا ہے۔ بھوانی مدد کے لیے تیار ہو جاتا ہے۔ اس اثنا میں کوریئلا فون پر بتاتی ہے کہ تینوں کو ''کلی منجارو'' پہنچا دیا گیا ہے۔ یہ نام سن کر شہزی مزید پریشان ہو جاتا ہے۔ اچانک بلراج سنگھ حملہ آور ہوتا ہے۔ مقابلے میں سی جی بھوانی مارا جاتا ہے۔ پھر شہزی کی ملاقات نانا شکور سے ہوتی ہے، جو ممبئی کا ایک بڑا اسمگلر تھا۔ نانا شکور شہزی کی مدد کے لیے تیار ہو جاتا ہے اور پھر شہزی، سوشیلا اور نانا شکور کے ہمراہ کلی منجارو کی طرف روانہ ہو جاتا ہے۔ نانا شکور کی سربراہی میں رات کی تاریکی میں سفر جاری تھا۔ چہائی کے گھنے دلدلی جنگل کی حدود شروع ہو چکی تھی کہ اچانک جنگلی وحشی زہریلے تیروں سے حملہ کر دیتے ہیں۔ شہزی اپنی گن سے جوابی فائرنگ کر کے کچھ جنگلی وحشیوں کو ختم کر دیتا ہے۔ پھر وہ وہاں سے نکل بھاگنے میں کامیاب ہو جاتے ہیں مگر تاریکی کی وجہ سے نانا شکور دلدل میں پھنس کر ہلاک ہو جاتا ہے۔ اس سناٹے میں اب شہزی اور زخمی سوشیلا کا سفر جاری تھا کہ وہ ایک نیم صحرائی علاقے میں پہنچ جاتا ہے جہاں حدِ نگاہ کالی چٹانوں کے سوا کچھ نہ تھا۔ سوشیلا کو جیپ میں چھوڑ کر خود ایک قریبی پہاڑی کا رخ کرتا ہے۔ واپسی کے لیے پلٹتا ہے تو ٹھٹک کر رک جاتا ہے کیونکہ ہر طرف سیاہ رنگ کے موٹے اور بڑے ڈنک والے بچھو تھے۔ بچھوؤں سے بچ نکلنے کے لیے وہ اندھادھند دوڑتا ہے۔ ڈھلوان پر دوڑتے ہوئے لڑکھڑا کر گر پڑتا ہے اور چٹانی پتھر سے ٹکرا کر بے ہوش ہو جاتا ہے۔ ہوش میں آنے پر خود کو ایک لانچ میں پاتا ہے۔ وہ لانچ میجر کیم کھلا اور اس کی بیٹی سونگ کھلا کی تھی۔ وہ نایاب کالے بچھوؤں کے شکاری تھے اور بچھوؤں کا کاروبار کرتے تھے۔ اچانک سونگ کھلا کی نظر بے ہوش شہزی پر پڑتی ہے اور اسے ان بچھوؤں سے بچا لیتی ہے۔ شہزی خود کو ایک ہندو ظاہر کر کے فرضی کہانی سنا کر باپ بیٹی کو اعتماد میں لے لیتا ہے۔ اس اثنا میں برمی مسلم گروپ کا مجاہد ٹولا ان پر حملہ کر دیتا ہے۔ شہزی کو جب یہ معلوم ہوتا ہے کہ کیم کھلا کو بے گناہ اور مظلوم برمی مسلمانوں کے قتل کا ٹاسک ملا ہوا ہے تو وہ کیم کھلا اور اس کے ساتھیوں کو جہنم واصل کر دیتا ہے، پھر نارتھ انڈیمان کے ساحل کا رخ کرتا ہے۔ جہاں کلی منجارین سے ٹاکرا ہو جاتا ہے۔ شہزی گھات لگا کر ان کے ایک ساتھی دیال اس کو قابو کر لیتا ہے اور اس کا بھیس بھر کر ان میں شامل ہو جاتا ہے۔ وہاں پتا چلتا ہے کہ اس سارے چکر میں جنرل کے ایل ایڈوانی کا ہاتھ ہے اور اس کا نائب بلراج سنگھ بھی موجود ہے۔ جنرل ایڈوانی یہاں اپنے خاص مشن کی تکمیل اور ٹھکانے کو مضبوط بنانے کے لیے ڈارک کیسل نام کی عمارت تعمیر کروا رہا تھا جس کے پیچھے بیرونی طاقتیں تھیں۔ ایڈوانی نے اپنے مکروہ مفادات کے لیے کلی منجارین سے مل کر جاوا قبیلے کے سردار کو مار کر پورے جاوا قبیلے کو اپنا غلام بنا لیا تھا۔ ایڈوانی اور بلراج شہزی کو دیال داس کے بہروپ میں پہچان نہ سکے اور وہ چالاکی سے اپنا اعتماد بحال کرنے میں کامیاب ہو جاتا ہے۔ پھر شہزی منصوبے کے تحت بلراج سنگھ کو جہنم واصل کرتا ہے۔ ایڈوانی ڈارک کیسل سے موٹر بوٹ کے ذریعے فرار کی کوشش کرتا ہے۔ شہزی ساتھیوں سمیت ایڈوانی کا پیچھا کرتا ہے اور اسے سمندر برد کر کے طلسم نور ہیرا حاصل کرنے میں کامیاب ہو جاتا ہے پھر ہندوستانی مچھیروں کے روپ میں پاکستان کے لیے روانہ ہوتے ہیں۔ راستے میں دونوں ملکوں کے کوسٹ گارڈز سے نمٹتے اپنی سرزمین پاکستان پہنچتے ہی زہرہ بانو سے رابطہ کرتا ہے۔ ملتان جانے سے پہلے لاڑکانہ پہنچ کر بشام کی بیوہ ارم سے ملتا ہے۔ وہاں کا زمیندار شاہ نواز خان جو پہلے بھی ہیرا چوری کر چکا تھا اب دوبارہ حاصل کرنے کے چکر میں بشام کی بیوہ پر نظر رکھے ہوئے تھا۔ شہزی وغیرہ کی آمد پر شاہ نواز خان دھوکے سے بشام کے قتل اور اس کی بیوہ ارم کے اغوا کے جرم کی رپورٹ کرا دیتا ہے۔ پولیس اول خیر اور کمبیل دادا کو پکڑ کر لے جاتی ہے۔ شہزی کو شاہ نواز خان اپنا قیدی بنا کر لے جاتا ہے۔ اچانک رات کے سناٹے میں خطرناک ڈاکو پریل چانڈیو حویلی پر حملہ آور ہوتا ہے۔ واپسی میں شاہ نواز کی بیٹی سونہڑیں بھی ساتھ ہوتی ہے جو اس کی محبوبہ ہے۔ جاتے ہوئے پریل، شہزی کو بھی اپنے اڈے پر لے جاتا ہے۔ اسی رات پریل کا نائب لائق ماچھی لانچ میں آ کر سازش کرتا ہے اور پریل کو غائب کرا کر خود سردار بن بیٹھتا ہے اور سونہڑیں کو تاوان کے لیے قبضے میں کر لیتا ہے۔ شہزی، لائق ماچھی کے ساتھی عارب خان کو قابو کر لیتا ہے۔ شہزی، پریل کو بچا لانے میں کامیاب ہو جاتا ہے۔ پریل، شہزی کا احسان مند ہوتا ہے اور اپنے ساتھیوں کے ہمراہ شہزی کے ساتھیوں اور سونہڑیں کو چھڑانے کے لیے تھانے پر حملہ کر دیتا مگر رینجرز کی اینٹی ڈکیت فورس وہاں پہلے سے موجود تھی۔ مقابلے میں پریل اور اس کے ساتھی مارے جاتے ہیں۔ شہزی اور اس کے ساتھی رینجرز کی تحویل میں چلے جاتے ہیں۔ شہزی، میجر وسیم کو اپنے بارے میں تمام حقائق سے آگاہ کرتا ہے، میجر وسیم، شہزی پر اعتماد کرتے ہوئے بھاری نفری کے ساتھ شاہ نواز کے خفیہ ڈیرے پر ریڈ کر کے طلسم نور ہیرا برآمد کر لیتے ہیں۔ اس مہم کے بعد شہزی اپنے ساتھیوں سمیت بیگم ولا کا رخ کرتا ہے جہاں شہزی کے والدین اور زہرہ کی نگاہیں منتظر تھیں۔ پاکستان پہنچ کر شہزی کو پتا چلتا ہے کہ عارفہ، نوید سانچے والا کی قید میں ہے عارفہ کو رہائی دلا کر نوید کو قانون کے شکنجے میں دے دیتا ہے پھر زہرہ کے تعاون اور ماں باپ کی دعاؤں کے سائے میں عابدہ کی رہائی کے لیے کمبیل دادا اور شکیلہ کے ساتھ نئے مشن پر امریکا روانا ہوتا ہے۔ طیارہ ابھی پاکستانی حدود میں تھا کہ شہزی کا ٹاکرا وزیر جان سے ہوتا ہے۔ مگر شہزی، وزیر جان کو چکما دے کر بھاگ نکلنے میں کامیاب ہو جاتا ہے اور ایک تھائی لڑکی سانچی سے ملاقات ہو جاتی ہے۔ وہاں ایک شاپنگ مال میں کچھ دہشت گرد حملہ آور ہوتے ہیں اور لوگوں کو یرغمال بنا کر اپنے قیدی چھڑانا چاہتے ہیں۔ ان کا سرغنہ، شہزی کے ہاتھوں مارا جاتا ہے۔ جو کاسا پوکو کا آدمی ہے۔ ایک مقام پر وزیر جان سے پھر ٹکراؤ ہو جاتا ہے۔ تادیر لڑائی کے بعد وزیر جان کو تہِ آب کر کے اپنے ازلی دشمن سے چھٹکارا پا لیتا ہے۔ وزیر جان کے خاتمے کے بعد کاسا پوکو کے ہرکارے شہزی کو بے ہوش کر کے پکڑ کر لے جاتے ہیں۔ کاسا پوکو، شہزی کی بہادری کا قائل ہو جاتا ہے اور خالص سونے کا گوتم بدھ کا مجسمہ جو پہلے ہی بینکاک میوزیم سے چرا لیا گیا تھا، اب اسے امریکا پہنچانا تھا۔ اور اس کے لیے کاسا پوکو شہزی کا انتخاب کرتا ہے اور امریکی ایجنٹ روڈلف کے ساتھ امریکا روانہ ہونا تھا کہ اسپیکٹرم کے ایجنٹوں سے ٹکراؤ ہو جاتا ہے۔ روڈلف ہر قدم پر اس کا ساتھ دیتا ہے اور بالآخر ایک طویل ساتھ دینے کے بعد روڈلف مارا جاتا ہے۔ روڈلف کی دوست یاسمین کے ساتھ شہزی امریکا روانہ ہوتا ہے۔ کوہارا یہاں بھی شہزی کا پیچھا نہیں چھوڑتا اور طیارہ ہائی جیک کر لیتا ہے اور طیارے کو موریانہ کے صحرا میں اتارنا چاہتا ہے مگر فیول ختم ہونے کے باعث طیارے کو کریش لینڈنگ کرنا پڑتی ہے یہاں شہزی سے دوبدو لڑائی میں کوہارا جہنم واصل ہو جاتا ہے۔ اور بالآخر شہزی کا جہاز شکاگو ائرپورٹ پر لینڈ کرتا ہے۔

ادھوری عورت

منظر امام

بہت کم لوگ ہوتے ہیں جو جذبات کو سمجھتے ہیں... خاص طور پر محبت کے جذبے کو... کچھ لوگ واقعی میں محبت کے دشمن ہوتے ہیں... ان سے یہ برداشت نہیں ہوتا کہ دو محبت کرنے والے چاہت و الفت کے باغیچے میں سکون و آشتی سے یک جاں رہیں... ایک ایسی ہی دل گداز کہانی... جس میں اچانک ہی ایک عفریت آگیا تھا...

کہانی لکھنے اور اس کے رموز سے آگاہ کرتی ادھوری کہانی......

وہ ایک مختلف خاتون تھیں۔ نوجوان سی، نازک...... خوبصورت۔ سب ان سے پیار کیا کرتے تھے۔ وہ ہماری لٹریچر کی ٹیچر تھیں۔ اردو ادب پڑھایا کرتیں۔ بولنے کا انداز بھی بہت زبردست تھا۔ ان کی ایک خاص بات یہ تھی کہ وہ پڑھاتے وقت صرف نصاب تک نہیں رہتی تھیں۔ بلکہ دنیا بھر کے واقعات بھی سنایا کرتیں۔ جن سے ان کے لیکچر میں جان پڑ جاتی تھی۔

ان کا نام جویریہ تھا۔

ایک دن وہ کہانیوں کی تاریخ بتا رہی تھیں کہ کہانیاں کہاں سے شروع ہوئیں۔ سب بہت دھیان سے سُن رہے تھے۔ وہ کہہ رہی تھیں۔ ”کہانیوں کی ابتدا اس طرح ہوئی کہ انسان اپنے وہ واقعات بتایا کرتا تھا جو دن بھر اس کے ساتھ ہوا کرتے۔ شام کے وقت سب ایک جگہ جمع ہو جاتے پھر واقعات بیان کیے جاتے۔ اس زمانے میں فینٹسی نہیں ہوا کرتی تھی۔ بس جو کچھ سامنے ہوتا، وہ بتا دیا جاتا۔ پھر آہستہ آہستہ اس میں زیبِ داستان کے لیے کچھ بڑھاتے چلے گئے۔ اور داستانوں کا سلسلہ شروع ہوا۔ ان داستانوں میں جن بھوت اور پریاں ہوا کرتیں۔ اس کے بعد ایسی کہانیوں کا دور آیا جب زندگی سے واقعات لیے جانے لگے۔ سیدھی سادی کہانیاں۔ سیدھے سادے انداز میں بیان کر دی جاتیں۔ باہر تو اس کی روایت بہت پہلے پڑ چکی تھی۔ اُردو میں منشی پریم چند نے ایسی کہانیاں شروع کیں اور آج تک یہ سلسلہ جاری ہے۔“

اس وقت رمشا کھڑی ہوتی۔ اس نے کہا۔ ”میڈم۔ مجھے بھی کہانیاں لکھنے کا شوق ہے۔ میں نے دو چار کہانیاں لکھی بھی ہیں۔“

”واہ۔ یہ تو بہت اچھی بات ہے۔ تم مجھے اپنی کہانیاں دکھانا۔“

”ضرور میڈم۔ میں کل لیتی آؤں گی۔“ اس نے کہا۔

رمشا کو اس بات کی خوشی تھی کہ جویریہ جیسی میڈم نے اس کی کہانیوں کو دیکھنے کی بات کی تھی۔ وہ جو بھی مشورہ دیتیں۔ وہ اس کے لیے سب سے بہتر ہوتا۔ کہانیاں لکھنے کا شوق اسے اپنے نانا سے ملا تھا۔ وہ ایک مشہور افسانہ نگار تھے۔ ان کے افسانوں کی دو کتابیں آ چکی تھیں۔ اگر وہ زندہ ہوتے تو کیا بات تھی۔ وہ ان ہی سے مشورے لیا کرتی۔ وہ خود بھی سوچ رہی تھی کہ کوئی تو اصلاح دینے والا مل جائے۔ اب اسے میڈم جویریہ مل گئی تھیں۔

دوسرے دن اس نے اپنی ڈائری اٹھائی اور کالج پہنچ گئی۔ انتظار کرتی رہی کہ پیریڈ ختم ہو اور میڈم اسٹاف روم میں پہنچ جائیں۔ پھر وہ ان کو اپنی کہانیاں دکھاوے۔ بہرحال پیریڈ ختم ہوا اور وہ اسٹاف روم میں پہنچ گئی۔ میڈم نے اسے اپنے سامنے بیٹھنے کو کہا۔ رمشا نے ڈائری ان کے سامنے رکھ دی۔ وہ ڈائری کا مطالعہ کرنے لگیں۔ رمشا سامنے بیٹھ کر ان کے تاثرات دیکھتی رہی۔ بہت دیر بعد انہوں نے رمشا کی طرف دیکھ کر کہا۔ ”رمشا۔ تم کہانیاں لکھ سکتی ہو۔ تم میں پوٹینشل ہے۔ تحریر میں روانی بھی ہے۔ لیکن تمہاری زیادہ تر کہانیاں فینٹسی پر مبنی ہیں۔ یعنی تصوراتی... خیالی... ماحول داستانوں والا ہے جبکہ ہمارا لٹریچر بہت آگے نکل چکا ہے۔ اب زندگی تمہارے آس پاس ہے۔ تم ان سے کہانیاں حاصل کر سکتی ہو۔“

”جی میڈم۔ میں کوشش کروں گی۔“

”تم اپنے آس پاس گھومتے کرداروں کو دیکھو۔ ہر قسم کے لوگ ملیں گے۔ مظلوم، ظالم، بے بس، مفلس... ہر آدمی اپنے ساتھ ایک کہانی لیے گھوم رہا ہے۔ تم ان کی کہانیاں لکھو۔ ان کو اپنے سامنے رکھو اور ان کے اردگرد اپنی کہانیاں تخلیق کر دو۔ جس حد تک زندگی کے پاس جا سکتی ہو، چلی جاؤ۔“

”کردار نہیں ملتے میڈم۔“ رمشا نے کہا۔

”مل جائیں گے۔ خود مجھے ایک کہانی یاد ہے۔ اگر کہو تو وہ سنا دوں۔ اس کو لکھ لینا۔ دیکھتی ہوں۔ کیسی کہانی لکھتی ہو۔“

”ضرور سنائیں میڈم۔“ رمشا خوش ہو گئی کہ ایک کہانی ملنے والی تھی۔

میڈم کا گھر اس کے گھر سے زیادہ دور نہیں تھا۔ ایک دو بار اپنے ابو کے ساتھ ان کے گھر کے سامنے سے گزر چکی تھی۔ اندر جانے کا اتفاق نہیں ہوا تھا۔ اس کے علاوہ رمشا کو میڈم کے حالات بھی نہیں معلوم تھے یعنی ان کی شادی ہوئی ہے یا نہیں۔ وغیرہ۔ اس دن رمشا نے میڈم سے کہا کہ اگر وہ کل فری ہوں تو میں ان کے پاس آ جاؤں۔ انہوں نے اجازت دے دی۔ رمشا نے ابو سے کہا۔ انہوں نے اسے میڈم کے گھر پہنچا دیا تھا۔

مکان کے اندر جانے کے لیے لکڑی کا چھوٹا سا گیٹ تھا۔ اس سے گزر کر دروازے تک پہنچا جا سکتا تھا۔ ایک راہداری سی بنی ہوئی تھی۔ اس کے دونوں طرف پھولوں کے پودے تھے۔ بہت سے پھول کھلے ہوئے بھی تھے۔ میڈم کا یہ شوق بھی زبردست تھا۔ وہ اپنے پودوں کی دیکھ بھال اور تراش خراش خود ہی کیا کرتی تھیں۔

رمشا نے ایک بار پوچھا تھا۔ ”میڈم میں کئی بار اپنے ابو کے ساتھ گزرتے ہوئے آپ کو پودوں کے ساتھ محنت کرتے ہوئے دیکھ چکی ہوں۔ آپ ان کی دیکھ بھال کے لیے کوئی مالی کیوں نہیں رکھ لیتیں؟“

”رمشا۔“ میڈم نے ایک گہری سانس لی۔ ”جانتی ہو۔ یہ جو پودے ہوتے ہیں، یہ لمس کو محسوس کر سکتے ہیں۔ ان کو اندازہ ہو جاتا ہے کہ کون ان کو نرمی اور پیار سے چھو رہا ہے۔ کون ان کے ساتھ بے رحم ہے اور وہ کس کے آنگن یا گھر میں پروان چڑھ رہے ہیں۔ اسی لیے اگر پودوں کے ساتھ پیار کا برتاؤ کرو تو وہ شاداب رہتے ہیں ورنہ مرجھا جاتے ہیں۔“

شکار کرنے کا اپنا ایک لطف ہے... لطف کی اس کیفیت کو وہی محسوس کر سکتا ہے... جو شکار جیسی دلچسپ مہم سے گزرا ہو... اس نے بھی دیکھا... سوچا اور پھر عمل کر ڈالا... محبت اور نفرت کے الائو سے گزرتے ایک شکاری کا بروقت حملہ...

ایک ہی تیر سے دو شکار کرنے والے ماہرِ فن کی دلچسپ کتھا......

دو شکار

سیرینا راض
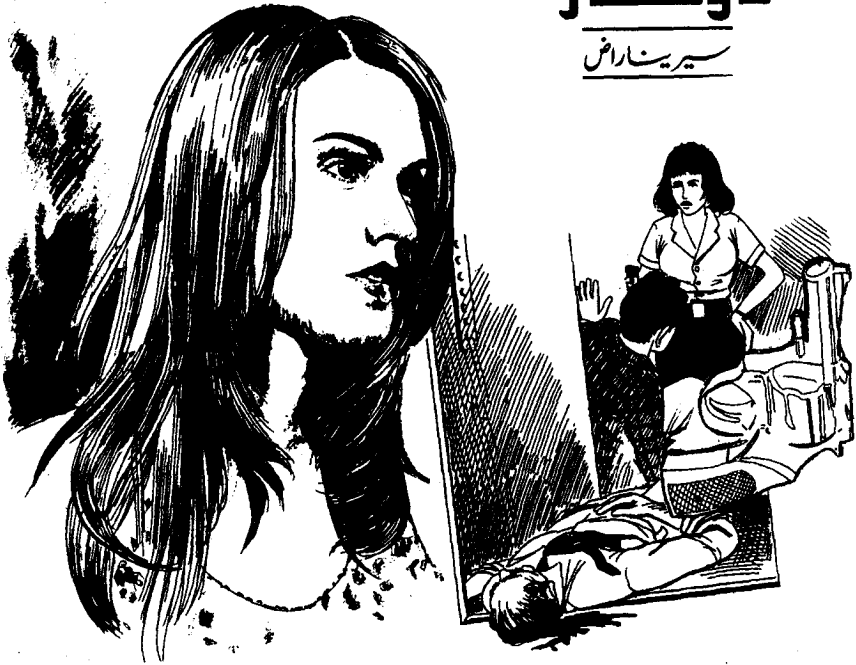
وہ گرمیوں کی ایک سہ پہر تھی جب پولیس ''کیوا کوم اینڈ اسٹے ان'' میں داخل ہوئی۔ اس وقت رولی ہوٹل میں موجود نہیں تھا۔ اس لیے میری کاؤنٹر پر بیٹھی ایک بروشر سے مکھیاں اڑا رہی تھی۔ جب اس نے لیری کا نام سنا تو اس کے کان کھڑے ہو گئے اور اس کی ریڑھ کی ہڈی میں سنسناہٹ ہونے لگی۔ اس نے اپنے آپ پر قابو پاتے ہوئے کہا۔

''ہاں...... کمرا نمبر تین سو بارہ، پیچھے کی جانب۔''

وہ جاننا چاہ رہے تھے کہ کیا وہ موجود ہے، کیا یہ ممکن ہے کہ وہ کمرا دیکھ سکیں؟ ان میں ایک دُبلا پتلا گوری چمڑی کا لڑکا

تھا اور دوسرا گول مٹول میکسیکو کا باشندہ جس کی داڑھی اور سر کے بال کھچڑی ہو چکے تھے۔ وہ بظاہر نرمی سے پیش آ رہے تھے لیکن ان کے چہروں پر تناؤ تھا۔

"میرا شوہر...... وہ اس وقت موجود نہیں ہے۔" اس نے ٹالنے کی کوشش کی۔

"اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔" موٹے پولیس والے نے کہا۔ "اس کی غیر موجودگی میں تم ہی یہاں کی انچارج ہو اور تم خود بھی فیصلہ کر سکتی ہو۔"

اس نے سیف کھول کر کمرے کی چابی نکالی اور انہیں کمرا نمبر 312 میں لے گئی۔ انہوں نے اندر قدم رکھتے ہی اپنا کام شروع کر دیا۔ تمام درازیں دیکھیں اور بستر کی چادریں بھی ہٹا دیں۔ دبلے لڑکے نے قالین کے کونے تک اٹھا کر دیکھے۔ میری ڈر رہی تھی کہ اس کی نظر کسی کاکروچ پر نہ پڑ جائے۔ انہوں نے نائٹ اسٹینڈ پر رکھے ہوئے رسالوں اور کتابوں کے صفحات بھی الٹ پلٹ کر دیکھے۔ موٹے نے تو حد ہی کر دی۔ اس نے لیری کی پتلونوں کی جیبوں تک کی تلاشی لی۔

میری گھبراہٹ اور پریشانی کے عالم میں بولی۔ "پلیز...... تم اس طرح اس جگہ کو برباد نہیں کر سکتے۔"

انہوں نے اس کی بات کو نظر انداز کر دیا تاہم وہ رولی سے کہہ سکتی تھی کہ اس نے پولیس والوں کو باز رکھنے کی پوری کوشش کی۔ اس ہوٹل کے کمرے بہت بڑے یا فینسی نہیں تھے لیکن میری کے خیال میں آرام دہ ضرور تھے۔ زیادہ تر میں دو بیڈ، ایک چھوٹا کچن اور باتھ روم تھا۔ میری کچن میں گئی اور کاؤنٹر پر جھک گئی جس کے سامنے سرامک کے کنستر رکھے ہوئے تھے۔

"تم ٹھیک تو ہو میڈم؟" موٹے پولیس والے نے پوچھا۔ اس کے ہاتھ میں سونے کی چین تھی جسے لیری کبھی، کبھی پہنتا تھا۔

"ہاں" اس نے اپنے ہاتھ قمیص سے صاف کیے اور دوبارہ کہا۔ "کیا میں پوچھ سکتی ہوں کہ یہ سب کیا ہے؟"

"یہ بہت اہم ہے کہ تم وہ سب کچھ بتا دو جو اس کے بارے میں جانتی ہو؟ وہ یہاں کب سے رہ رہا ہے؟"

میری نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔ "شاید ایک مہینا یا اس کے لگ بھگ۔ ہاں اسے یہاں رہتے ہوئے تینتیس دن ہو گئے۔"

"اور آخری بار تم نے اسے کب دیکھا؟"

"مجھے نہیں معلوم...... ہم اپنے مہمانوں کی آمد و رفت پر نظر نہیں رکھتے۔" اس نے اپنے سینڈلوں کی طرف دیکھا جو انتہائی معمولی اور سستے تھے۔ اس نے اس وقت بھی یہی سینڈل پہن رکھے تھے جب گزشتہ بدھ کو آخری بار لیری کو باہر جاتے دیکھا۔ وہ اپنی نیلے رنگ کی کار نکال رہا تھا۔ اس نے سوچا کہ شاید وہ لنچ کے لیے گیا ہے اور وہ احمقوں کی طرح دو گھنٹے تک اس کے انتظار میں بھوکی بیٹھی رہی کہ شاید وہ اس کے لیے ہوٹل سے کھانا یا سینڈوچ لے کر آئے۔

"کیا اس نے کچھ کیا ہے؟" اس نے پولیس والوں سے پوچھا۔ وہ کھڑے کھڑے تھک گئی تھی اور بیٹھنا چاہ رہی تھی۔

انہوں نے اس سوال کو بھی نظر انداز کر دیا۔ دُبلا پولیس آفیسر بولا۔ "وہ کس قسم کا کرایہ دار تھا؟"

میری نے گہرا سانس لیا اور بولی۔ "دیکھنے میں تو وہ ٹھیک ہی لگتا تھا۔ اس نے ہمیشہ وقت پر بل ادا کیا۔ کبھی کوئی مسئلہ نہیں ہوا۔"

"کیا وہ یہاں عورتوں کو بھی لاتا تھا؟"

"نہیں۔" وہ جلدی سے بولی۔ اس سے پہلے کہ وہ کوئی اور سوال کرتے، دروازے پر ایک آواز سنائی دی۔ موٹے پولیس آفیسر کا ہاتھ فوراً ہی اپنی گن پر گیا۔ کمرے کا دروازہ کھلا اور رولی گھبرایا ہوا اندر داخل ہوا۔ اس نے میری پر اپنی توجہ مرکوز کی اور مشتبہ انداز میں اسے دیکھنے لگا۔

"یہاں کیا ہو رہا ہے؟" وہ سیدھا میری کی طرف آیا اور بھاری ہاتھ اس کے کندھے پر رکھ دیا۔ وہ اس کے غصے کو محسوس کر سکتی تھی۔ اس کی سانسوں سے شراب کی بُو آ رہی تھی اور میری سوچنے لگی کہ آج یہ کتنے پیسے ضائع کر کے آیا ہے۔

موٹا آفیسر تھوڑا سا پُرسکون ہوا، اس نے اپنا ہاتھ ہولسٹر پر سے ہٹایا اور بولا۔ "ہم یہاں ایک تفتیش کے سلسلے میں آئے ہیں۔"

"تمہارے پاس وارنٹ ہے؟"

"تمہاری بیوی نے ہمیں اندر آنے کی اجازت دی۔" دبلے پولیس آفیسر نے کہا۔

رولی نے اسے غصے سے دیکھا۔ میری ان نظروں کی عادی ہو چکی تھی۔ اس نے ٹالنے کی غرض سے کہا۔ "ٹھیک ہے، کوئی بات نہیں...... یہ معاملہ اہم تھا۔" تاہم اسے اپنے آپ پر غصہ آ رہا تھا کہ اس نے پہلے ہی ان پولیس والوں سے اس بارے میں کیوں نہیں پوچھا۔ لہٰذا رولی کی ناراضی درست تھی۔

موٹا پولیس آفیسر ان دونوں کے سامنے سے گزر کر ان کنستروں کی جانب بڑھا جو انہوں نے ہر کمرے میں رکھنے

محبت سے نفرت اور اعتبار کے موسم سے بے اعتباری کا موسم آنے میں زیادہ دیر نہیں لگتی... وہ اپنے بچپن سے اس کا شیدائی تھا... عمر کا ہر دور اس کے سنگ گزارنے کی عادت پختہ ہو چکی تھی... اب لمحے بھر کی جدائی بھی اسے گوارا نہ تھی...

انتہائے محبت اور انتہائے نفرت میں چھپے انتقام میں قدرت کا کھیل......

قدرت کا کھیل

تمکین رضا

رات کے نو بجتے ہی سارا علاقہ لوڈشیڈنگ کے باعث اندھیرے میں ڈوب گیا۔ روشانے کو اسی وقت کا انتظار تھا۔ بجلی جاتے ہی وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔ کپڑے کا ماسک چہرے پر سیدھا کیا۔ جیکٹ کا ہڈ سر پر کیا اور اپنی جیبوں میں مطلوبہ اشیا کی موجودگی کی تصدیق کرتے ہوئے، کمرے سے باہر نکل آئی۔ باہر ٹھنڈی یخ ہوا نے اس کا استقبال کیا۔ وہ جھرجھری لے کے رہ گئی۔ جیکٹ کی زپ اس نے ممکنہ حد تک اوپر کی اور جیبوں میں ہاتھ ڈال

کے تیزی سے ایک طرف ہولی۔

رات کے اندھیرے میں سنسان گلی میں اس کے قدموں کی چاپ گونجنے لگی۔

گلی میں ملگجا سا اندھیرا پھیلا تھا۔ وہ راستوں سے آشنا تھی اس لیے کم روشنی میں بھی اسے چلتے ہوئے کوئی دشواری پیش نہیں آرہی تھی۔

چند گلیاں کراس کرنے کے بعد اس نے اپنی رفتار سست کرلی۔ اب اس کا انداز ایسا تھا جیسے کوئی منچلا چہل قدمی کررہا ہو۔

اپنی مقررہ جگہ پر پہنچتے ہی وہ دیوار کے ساتھ لگ کے کھڑی ہوگئی۔

اس کے جسم میں سنسنی کی لہریں دوڑنے لگی۔ یہ کیفیت اس کے لیے سُرور کا باعث تھی۔ اسی کیفیت کا لطف اٹھانے کے لیے تو وہ اس ٹھٹھرتی رات میں گھر کا فرحت بخش سکون چھوڑ کے یہاں تاریک گلی میں آن کھڑی ہوئی تھی۔

اس کا ہاتھ جیکٹ کی جیب میں پستول کو گرفت میں لیے ہوئے تھا۔ پستول کے سرد لمس نے اس کے خون کی روانی تیز کررکھی تھی۔ وہ چوکنا انداز میں گلی کے سرے پر دیکھ رہی تھی۔

انتظار کی گھڑیاں طویل ہونے لگیں۔ اسے سگریٹ کی طلب ہورہی تھی لیکن اس وقت وہ سگریٹ نوشی کی متحمل نہیں ہوسکتی تھی۔ وہ خود پر ضبط کرتے ہوئے اضطراری انداز میں ہاتھ ملنے لگی۔ سردی آج کچھ زیادہ ہی تھی۔ اسے ہڈیوں میں گودا جمتا محسوس ہونے لگا۔

''لگتا ہے آج اپنی قسمت خراب ہے۔'' اس نے خودکلامی کی۔ وہ واپسی کا سوچ ہی رہی تھی کہ اچانک گلی میں قدموں کی چاپ ابھری۔ وہ چوکنا ہوگئی۔

ایک ہیولا تیزی سے گلی میں چلتا، اس کی طرف بڑھ رہا تھا۔ وہ خاصا بھاری بھرکم آدمی لگ رہا تھا۔

روشانے کی گرفت پستول پر مضبوط ہوگئی۔ ہیولا بےفکری سے چلتا ہوا اس کے سامنے سے گزر رہا تھا کہ اس نے اپنی جگہ چھوڑ دی۔ جیب میں موجود پستول اس کے ہاتھ میں منتقل ہوچکا تھا۔

☆☆☆

وجدان علی کی رگوں میں لہو جیسے اچھل رہا تھا۔ اس نے اپنے دونوں ہاتھوں سے اپنے بال مضبوطی سے جکڑے ہوئے تھے۔ اس کی نظریں کمرے کے دروازے پر ٹکی ہوئی تھیں۔ ان نظروں میں نفرت اور غصے کے ساتھ بےبسی کے جذبات رقم تھے۔ ان منفی جذبات نے اس کے چہرے کے خوبصورت نقوش کو بگاڑ دیا تھا۔

کچھ دیر قبل شانی اور اس کا زوردار جھگڑا ہوا تھا۔ محلے کے لوگوں نے آکے ان کا بیچ بچاؤ کرایا تھا ورنہ وجدان شاید بیساکھی کے وار سے شانی کا سر ہی پھاڑ دیتا۔

پڑوسیوں کے آتے ہی شانی تو اپنے کمرے میں محصور ہوگئی تاہم اسے لوگوں کی طنزیہ نگاہوں اور طعنوں کا سامنا کرنا پڑا۔

وہ اس سے جھگڑے کی وجہ جاننا چاہ رہے تھے، حالانکہ وہ شانی کے طرزِ زندگی سے بخوبی آگاہ تھے۔

بڑی مشکل سے اس نے پڑوسیوں سے جان چھڑائی اور انہیں گھر بھیج دیا۔ ان کے جاتے ہی وہ کرسی پر ڈھے گیا۔ اس کا دماغ لاوے کی طرح اُبل رہا تھا۔ زندگی میں پہلی بار اسے شانی سے شدید نفرت محسوس ہوئی تھی۔

وجدان اپنے والدین کی اکلوتی اولاد تھی۔ اس لیے اس کے والدین اس کے معاملے میں حد درجہ محتاط تھے۔ وہ اسے گھر سے نکلنے ہی نہ دیتے۔ اسکول سے آکے وہ گھر میں پڑا رہتا۔ کبھی کوئی پڑوسی بچہ آجاتا تو وہ اس کے ساتھ کھیلتا ورنہ اس کے کھلونے ہوتے یا کمپیوٹر۔ اس طرح تنہا رہنے سے اس کی شخصیت میں وہ اعتماد پیدا نہ ہوا تھا جو ایک مرد کا خاصہ ہوتا ہے۔

بچپن کی زندگی کے آٹھ سے گیارہ سال کی عمر کے وہ تین سال اس کی زندگی کا خوبصورت ترین دور تھا جب شانی اور اس کے والدین ان کے پڑوس میں آکے آباد ہوئے تھے۔

شانی کے ابو آرمی میں تھے اس لیے وہ قریہ قریہ گھومتے رہتے تھے۔ جب ان کا ٹرانسفر اس شہر میں ہوا تو وہ ان کے گھر کے قریب ہی آکے رہے۔ شانی اس کی خالہ زاد تھی اس لیے دونوں گھرانوں میں شروع میں ہی میل جول پیدا ہوگیا۔ شانی اس کی ہم عمر تھی اور اس شہر میں اس کا کوئی دوست نہ تھا۔ دوسری طرف وجدان بھی گھر میں اکیلا ہی ہوتا تھا۔ یہ قدرِ مشترک دونوں کو قریب لے آئی۔ شانی، وجدان کو بہت پیاری لگتی تھی، خوبصورت تو وہ تھی ہی لیکن اس کی شخصیت میں ایسا انوکھا اعتماد تھا جس نے وجدان کو مسحور کرلیا تھا۔ اس کے مقابلے میں وہ خود خاصا دبّو سا تھا۔ شخصیات کا یہ تضاد بھی دونوں کو قریب لانے میں معاون ثابت ہوا۔ شانی کے مزاج میں حاکمانہ پن تھا تو وجدان

دوسری قسط

الاؤ

کاشف زبیر

الاؤ... مرحوم کاشف زبیر کی آخری سلسلے وار تحریر ہے... جو انہوں نے بڑے ذوق و شوق سے قارئین کے لیے تحریر کرنا شروع کی...لیکن دستِ قضا نے ان کو اتنی مہلت نہیں دی کہ وہ چندسنسنی خیز اقساط لکھنے کے بعد اپنے قلم سے اسے اختتام تک پہنچا سکیں... اس دلچسپ اور پُرتجسس کہانی کو اسی انداز میں انجام تک لے جانا ایک امتحان تھا... آخرکار آپ کے جانے پہچانے اور مقبول و معروف مصنف کو یہ کام سونپا گیا جو کاشف زبیر کی لکھی ہوئی اقساط کے بعد قارئین کے لیے اپنے ہنر کے جوہر دکھائیں گے... **الاؤ** ایکشن، تھرل اور سسپنس سے بھرپور ایسی داستان ہے جو قارئین کو اول تا آخر اپنی گرفت میں رکھے گی...

انسان نما درندوں کی داستان وہ جیتے جاگتے ہم نفسوں کو بھی بازار کی جنس بنا دیتے ہیں

مجھے ہوش آیا تو میں بیڈ پر تھا۔ سفید چھت سرمئی رنگ کی دیواریں اور مخصوص بیڈ کے ساتھ مخصوص دواؤں کی بُو بتا رہی تھی کہ میں اسپتال میں ہوں۔ اسی اسپتال میں جہاں مردہ خانے کی ایک سل پر عادل کی لاش موجود تھی۔ عادل کا خیال آتے ہی میں ایک جھٹکے سے اٹھ بیٹھا۔ اسی لمحے کسی نے میرے شانے پر ہاتھ رکھا۔ ''آرام سے...... پلیز آرام سے......''

میں نے اس حسین لڑکی کی طرف دیکھا جس نے ڈاکٹر کوٹ پہنا ہوا تھا اور اس کے گلے میں اسٹیتھس اسکوپ لٹک رہا تھا۔ میں نے غم زدہ آواز میں کہا۔ ''عادل میرا بھائی......''

لڑکی کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔ ''میں جانتی ہوں...... آپ نے مجھے پہچانا نہیں...... میں حمیرا ہوں آپ کی حمیرا...... عادل کے دوست ماجد کی بہن۔''

تب مجھے احساس ہوا کہ وہ جانی پہچانی کیوں لگ رہی تھی۔ دراصل میں نے اس پر غور ہی نہیں کیا تھا۔ میں تو عادل کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ ''سوری حمیرا...... میں بہت ڈسٹرب ہوں۔''

''میں جانتی ہوں...... آپ لیٹ جائیں۔''

''میں لیٹ نہیں سکتا۔'' میں وحشت زدہ ہونے لگا۔ مجھے لگ رہا تھا جیسے میں پاگل ہو جاؤں گا اپنے ہوش و حواس کھو دوں گا مگر ایسا ہوا نہیں تھا۔ میرا جسم سن ہو رہا تھا اور ذہن پر ایک خاص ٹھہراؤ کی کیفیت تھی۔ میرے بازو پر انجکشن کا نشان تھا شاید مجھے ذہنی سکون کے لیے کوئی دوا دی گئی تھی۔ عادل کی ایک جھلک دیکھنے کے بعد مجھے ہوش نہیں رہا تھا۔ میں نے کلائی کی گھڑی میں وقت دیکھا۔ شام کے چار بج رہے تھے اور مجھے بے ہوش ہوئے پانچ گھنٹے ہو چکے تھے۔ حمیرا نے ایک انرجی ڈرنک میری طرف بڑھائی۔

''یہ لیجیے آپ کو اس کی ضرورت ہے۔''

میں اس قسم کی انرجی ڈرنکس کے خلاف ہوں لیکن اس وقت مجھے ضرورت محسوس ہو رہی تھی۔ میرا گلا خشک تھا۔ میں نے ٹن ایک ہی سانس میں خالی کر دیا۔ مجھے اپنے اندر توانائی محسوس ہوئی تھی۔ ''شکریہ۔''

''اس کی ضرورت نہیں ہے، عادل میرے لیے ماجد کی طرح تھا۔'' اس کا لہجہ نم ہوا لیکن پھر اس نے خود پر قابو پا لیا۔

''عادل......'' میں نے پھر کہنا چاہا تو وہ بولی۔

''پاپا آگئے ہیں وہ دیکھ رہے ہیں سب۔''

ایک وقت تھا جب عادل نے ماجد کی وفات پر سب دیکھا تھا اور گھر کے فرد کی طرح ان لوگوں کا ساتھ دیا تھا۔ اب خود اسے دیکھا جا رہا تھا۔ میرے اندر دکھ کی لہر اٹھ رہی تھی اور میں اسے قابو کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ موت برحق ہے اور ہر ذی روح کو اس کا ذائقہ چکھنا ہے۔ موت بچے بوڑھے اور مرد و عورت کی پروا نہیں کرتی ہے۔ وہ اپنے وقت پر آتی ہے اور سب کو ساتھ لے جاتی ہے۔ عادل کا وقت آگیا تھا اور وہ چلا گیا۔ یہ دکھ اور جدائی دائمی تھی اور مجھے صبر کرنا تھا۔ کچھ دیر بعد میں حمیرا کی طرف متوجہ ہو گیا۔ اس کے چہرے کی معصومیت ویسی ہی تھی مگر جسم کسی قدر بھر گیا تھا۔ میں اسے دیکھ رہا تھا اور ماضی کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ وہ ذرا سرخ ہوئی تھی بلکہ یہ کہنا چاہیے کہ مزید سرخ ہوئی۔ شاید میرے اس طرح دیکھنے سے اس نے کچھ اور سمجھا تھا۔ ''اب کیسا محسوس کر رہے ہیں؟''

میں نے سر ہلایا۔ ''بہتر ہوں کوئی دوا دی تھی؟''

''ہاں اعصاب کو سکون دینے والی دوا دی ہے۔''

''تمہیں کو کیسے پتا چلا؟''

''شاداب صاحب سے...... ان کی ابو سے بھی سلام دعا ہے اور وہ جانتے ہیں کہ عادل ہمارے گھر آتا جاتا تھا۔''

عادل کے نام پر پھر میرے دل میں ہوک سی اٹھی۔

''تم جانتی ہو اس کے ساتھ...... کیا ہوا؟''

''نہیں میری ڈیوٹی جنرل وارڈ میں ہے لیکن میں نے معلوم کیا ہے۔ یہ مرڈر ہے۔''

''مرڈر۔'' میں نے کہا۔ ''مگر کیوں...... کیسے؟''

''مجھے پوری تفصیل تو نہیں معلوم لیکن اتنا پتا چلا ہے کہ جسم کے اندرونی اعضا غائب ہیں۔''

یہ بھی ایک اندوہناک انکشاف تھا کہ کسی نے عادل کو قتل ہی نہیں کیا تھا، اس کے اعضا بھی نکال لیے تھے۔ ایسا تو شدید دشمنی میں کیا جاتا ہے۔ اس کی کس سے دشمنی تھی۔ میں نے سر تھام لیا۔ حمیرا پریشان ہو گئی۔ ''پلیز آپ ٹینشن نہ لیں...... پولیس معاملے کو دیکھ رہی ہے...... شاداب صاحب آئے ہوئے ہیں۔''

''میں شاداب سے ملنا چاہتا ہوں۔'' میں نے کہا۔

''ایک منٹ، میں کسی کو بھیج کر بتاتی ہوں کہ آپ اٹھ گئے ہیں۔'' حمیرا نے کہا اور کمرے سے نکل گئی۔ یہ پرائیویٹ لیکن عام کمرا تھا۔ یقیناً بے ہوشی کے بعد میں عارضی طور پر یہاں لایا گیا تھا۔ تقریباً دس منٹ بعد حمیرا شاداب کے ساتھ اندر آئی۔ شاداب نے میرا ہاتھ تھام لیا۔

کہتے ہیں کہ ایسا بیج بوئو کہ جب وہ تناور درخت کی صورت اختیار کرے تو اس کا پھل کھایا جاسکے... ایسا بیج نہ بوئو جو وقت گزرنے کے بعد اپنے لیے ہی کڑوا ثابت ہو... ماضی سے جڑے ایسے ہی اعمال جو زمانۂ حال کو برباد کررہے تھے...

اپنی ذات کو ہتھیار بنانے والے شخص کا قصۂ عبرت

چاہ درپیش

کوثر اسلام

خاور بیگ حسبِ معمول صبح سویرے اٹھا اور واک کے لیے قریبی پارک چلا گیا۔ سویرے سویرے واک کرنا اسکول کے زمانے سے اس کی عادت تھی۔ جب وہ ایک معمولی ورکر تھا تب بھی واک کرتا تھا اور جب اُسے الیکشن لڑنے کے لیے پارٹی کی طرف سے ٹکٹ مل گیا تب بھی بلاناغہ واک کرتا ہے۔

پارک میں واک کے لیے ایک خوبصورت ٹریک بنایا گیا تھا جس کے ساتھ ساتھ پودے لگے ہوئے تھے۔

پودوں کو تراش خراش کر ایک سائز میں کرلیا گیا تھا۔
خاور واکنگ ٹریک پر قدرے تیز تیز جارہا تھا۔ اس نے دونوں ہاتھ سینے کے ساتھ لگا رکھے تھے۔ وہ آج کے پروگرام کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ ناشتے کے بعد اسے دفتر جانا تھا، نو بجے اسے ایک جلسے سے خطاب کرنا تھا۔ گیارہ بجے ایک اور جلسہ تھا۔ دو بجے ورکرز میٹنگ تھی۔ چار بجے علاقے کی اہم شخصیات سے ملاقات طے تھی۔ نو بجے ایک کارنر میٹنگ میں شرکت کرنی تھی۔
یہ سب سوچتے سوچتے وہ سامنے دیکھ رہا تھا۔ تقریباً چالیس گز کے فاصلے پر ایک موڑ تھا۔ موڑ کے ساتھ ایک ڈرم رکھا گیا تھا۔ ڈرم میں پلاسٹک بیگ، خالی بوتلیں اور کوڑا وغیرہ ڈالا جاتا تھا۔ یہ ڈرم پورے باغ میں جگہ جگہ رکھے گئے تھے اور ہر صبح خالی کر دیے جاتے تھے۔
جب موڑ سے اس کا فاصلہ تیس گز رہ گیا تو اچانک فائر کی آواز سے فضا مرتعش ہوگئی۔ درختوں سے پرندے شور مچاتے ہوئے اُڑ گئے۔ ایک سنسناتی ہوئی گولی آئی اور خاور کے دل میں پیوست ہوگئی۔ اس کے منہ سے آواز بھی نہ نکل سکی، وہ لڑکھڑا کر گر پڑا۔ ایک گولی نے اس کے تمام منصوبوں پر پانی پھیر دیا تھا۔ اس کی بے جان آنکھیں تقدیر کے اس ستم پر حیران تھیں۔

☆☆☆

انسپکٹر حماد کو اس تھانے آئے ہوئے ابھی چند دن ہی ہوئے تھے۔ اس کا قد نکلتا ہوا جبکہ جسم قدرے دبلا تھا۔ باریک مونچھیں اور آنکھوں میں چمک تھی۔ جبکہ کشادہ پیشانی ذہانت کی آئینہ دار تھی۔
سب انسپکٹر ذیشان بھی اس کے ساتھ تھا دونوں... بچپن کے دوست تھے۔ ایک ہی اسکول اور کالج میں پڑھا۔ دونوں کا ایک ہی شوق تھا۔ اسی شوق کی وجہ سے دونوں نے پولیس کی ملازمت اختیار کی ورنہ دونوں کا تعلق کھاتے پیتے گھرانے سے تھا۔
انسپکٹر حماد نے فجر کی نماز پڑھی۔ سورۂ یاسین کی تلاوت کے بعد وہ ناشتے کے لیے اٹھنے والا تھا کہ اچانک فون کی گھنٹی بجی۔ اس نے سب انسپکٹر ذیشان کو آواز دی۔
''شانی ذرا دیکھو کس کا فون ہے؟''
سب انسپکٹر ذیشان نے ریسیور کان سے لگایا تو دوسری طرف سے کہا گیا۔
''ہیلو...... کیا یہ تھانہ فقیر آباد ہے۔''
''جی جی...... کہیے۔''
''معروف سیاسی شخصیت خاور بیگ کو گرین پارک میں قتل کر دیا گیا ہے، آپ فوراً پہنچ جائیں۔''
دوسری طرف سے رابطہ منقطع ہوا۔ ریسیور رکھنے کے بعد اس نے انسپکٹر حماد کو اطلاع دی۔ دونوں معمولی تیاری کے بعد فوراً جائے وقوعہ پر پہنچ گئے۔
لاش کے قریب کافی... لوگ جمع ہو گئے تھے۔ انہوں نے سب کو ہٹا کر لاش کا معائنہ کیا۔ معائنے کے بعد انسپکٹر حماد نے سب انسپکٹر سے کہا۔
''ذیشان...... فوٹو گرافر کو بلاؤ، مجھے لاش اور اس جگہ کی ہر اینگل سے تصاویر کی ضرورت پڑے گی اور لاش کو پوسٹ مارٹم کے لیے لے جانے کا بندوبست کرو۔ بیگ صاحب کے گھر والوں کو اگر ابھی اطلاع نہ پہنچی ہو تو مناسب طریقے سے انہیں مطلع کرو۔''
سب انسپکٹر ذیشان کو ہدایات دینے کے بعد وہ وہاں موجود لوگوں کی طرف متوجہ ہوا۔
''آپ میں سے کال کس نے کی تھی؟''
''جی میں نے کی تھی۔'' ایک نوجوان نے آگے بڑھ کر کہا۔ ''میرا نام اعظم ہے اور یہ میرا دوست فواد ہے۔'' اس نے ایک لڑکے کی طرف اشارہ کر کے کہا۔
''ہم ہر روز یہاں واک کے لیے آتے ہیں آج بھی حسبِ معمول ہم واک کر رہے تھے کہ اچانک ہم نے گولی کی آواز سنی پھر کچھ لمحوں بعد ہم نے چیخنے کی آوازیں سنیں ہم دوڑتے ہوئے آئے تو بیگ صاحب کی لاش خون میں لت پت پڑی تھی اور وہ لڑکا چیخ رہا تھا۔'' اس نے ہاتھ سے ایک طرف اشارہ کیا۔
انسپکٹر حماد نے گھوم کر اس طرف دیکھا۔ میلے کچیلے کپڑوں میں ایک چودہ پندرہ سالہ لڑکا سہما ہوا کھڑا تھا۔ اس کے پاس ایک میلی کچیلی بوری تھی جو جگہ جگہ سے پھٹی ہوئی تھی۔ بوری میں کباڑ بھرا ہوا تھا۔ لڑکے نے بوری زمین پر رکھی تھی اور اسے ایک طرف سے پکڑ رکھا تھا۔ انسپکٹر حماد اس کے پاس گیا اور پیار سے پوچھا۔
''تمہارا نام کیا ہے بیٹے؟''
''مم...... مم...... من...... صور۔'' لڑکے نے اٹک کر کہا۔
''منصور بیٹے...... ڈرو نہیں، میں تمہارے ساتھ ہوں۔ یہ بتاؤ تم نے کیا دیکھا؟''
لڑکا کچھ دیر خاموش رہا، وہ بہت گھبرایا ہوا تھا۔ اس

جرم کی آگ

پرویز احمد لانگاہ

جرم کی آگ بہت تیزی سے پھیلتی ہے... اس کے اندھے شعلے اطراف میں بکھری ہر شے کو اپنی لپیٹ میں لیتے چلے جاتے ہیں... دولت و طاقت کے نشے میں حکمرانی کرنے والے مجرموں کا ٹکرائو... ان ظالموں کی رسی دراز ہوتی جارہی تھی۔

دو محبت کرنے والے دل جو ایک ہی ساز پر دھڑک رہے تھے

دور اُفق میں شام کے گہرے ہوتے سائے میں پہاڑ کسی ہیولے کے مانند نظر آرہے تھے۔ سورج کی سنہری کرنیں جیسے کسی مصور کی تصویر سے نکل کر آنکھوں کو بھا رہی تھیں۔ فضا میں چھائی خنکی طبیعت پر خوشگوار اثر ڈال رہی تھی لیکن ایک شخص ایسا بھی تھا جس کے دل کا موسم سوگوار تھا۔ چست لیدر کی پینٹ کے ساتھ اس نے ٹی شرٹ کے اوپر بھی ایک لیدر جیکٹ پہن رکھی تھی۔ سلگتے سگریٹ کے شعلے اور منہ سے اُگلتے دھوئیں کی وجہ سے اس کے زندہ ہونے کا گمان

ہوتا تھا ورنہ چٹان پر بیٹھا وہ کسی یونانی دیوتا کے سنگی مجسمے کی طرح دکھائی دے رہا تھا۔

جیک گارسیا نے اچانک ہی حرکت کی اور سگریٹ ایک جانب اچھال دی۔ وہ کسی گہری سوچ میں ڈوبا ہوا تھا۔ اچانک وہ اٹھا اور یوں دکھائی دیا کہ وہ جیسے کسی حتمی نتیجے پر پہنچ گیا ہو۔ اُسے ویرانے میں اپنی سوچ کو یکسو کرنے میں بڑی مدد ملی تھی۔ اس نے اپنی بیلٹ میں اُڑسا ہوا مشہور زمانہ گلوک پسٹل نکالا، چیمبر چیک کیا اور گاڑی کی جانب چل پڑا۔ اس کے چہرے سے ہی ظاہر تھا کہ کسی طوفانِ بلاخیز کی آمد ہے۔

☆☆☆

رالف نے اپنی اسپورٹس کار پارکنگ میں روکنے کے بعد اپنے سن گلاسز کو آنکھوں سے اتار کر جیب میں ڈالا اور خراماں خراماں کالج کی مین بلڈنگ کی طرف چل پڑا۔ وہ بیس سال کا جوان اور ہینڈسم لڑکا تھا جو کالج کی لڑکیوں میں کافی مشہور تھا۔ امیر ہونے کے ساتھ ساتھ وہ بہت اسٹائلش بھی تھا، اس کی گوری رنگت میں اطالوی خون کی آمیزش نے اسے صنفِ مخالف کے لیے بے پناہ کشش کا مالک بنا دیا تھا۔

وہ چاہتا تو پلے بوائے بن کر کئی لڑکیوں سے اپنا مطلب پورا کر سکتا تھا مگر اس کا دل صرف نتاشا کے لیے دھڑکتا تھا۔ اس نے اپنا سب کچھ بس اس ایک حسینہ کے لیے وقف کر دیا تھا کیونکہ اس کی سبز آنکھیں رالف کو بہت بھاتی تھیں۔

”نتاشا؟“ رالف نے درخت کے نیچے بیٹھی ہوئی نتاشا کو اپنی جانب متوجہ کیا۔ کالج میں کلاس کے بعد وہ دونوں اسی جگہ بیٹھ کر اپنی محبت کی پینگیں بڑھاتے تھے۔

”ہوں۔“ وہ بولی۔

”کیسی ہو؟“ رالف نے اس کے ساتھ بیٹھتے ہوئے پوچھا۔

”جب تمہارے ساتھ ہوتی ہوں تو خود بخود اچھی ہو جاتی ہوں۔“ وہ ہنسی۔

”ہائے۔ ایسے نہ ہنسا کرو۔“ رالف نے سینے پر ہاتھ رکھتے ہوئے ٹھنڈی آہ بھری۔

”کیوں؟“ وہ اٹھلاتے ہوئے بولی۔

”کیوں کہ پھر مجھے تم اتنی پیاری لگتی ہو کہ خود پہ قابو پانا مشکل ہو جاتا ہے۔“

”تو کس نے کہا ہے کہ خود پہ قابو رکھو؟“ نتاشا نے بے باک ہو کر کہا۔

یہ سن کر رالف موقع سے فائدہ نہ اٹھاتا تو بے وقوف کہلاتا۔ اس نے نتاشا کو فرنچ کِس کی اور پھر اس کی گود میں ہی سر رکھ کر لیٹ گیا۔ جس معاشرے کے وہ باسی تھے وہاں ایسی باتوں پر کوئی توجہ بھی نہیں دیتا تھا۔

”ویک اینڈ کی رات ڈنر کے بارے میں کیا خیال ہے؟“ رالف نے رومانوی لمحات سے لطف اندوز ہونے کے بعد پوچھا۔

”ویسے تو میرا کچھ اور پلان تھا مگر سوچ رہی ہوں تمہارے ساتھ ڈنر کرنے میں کوئی حرج نہیں۔“ رالف اِس کا جواب سن کر خوشی سے نہال ہو گیا اور مدہوش نگاہوں سے دیکھتا ہوا وہاں سے اٹھ گیا۔

اسے بہت سے لوگوں نے سمجھایا تھا کہ نتاشا سے دور رہو۔ وہ انڈر ورلڈ کے ڈان کی بیٹی ہے مگر رالف کسی کی نہیں سنتا تھا۔ محبت کا جادو اُس کے سر پر سوار تھا اور وہ ہر وقت نتاشا کی طرف پیش قدمی کرتا رہتا تھا۔ وہ اپنی پیش قدمی روک بھی دیتا اگر سامنے سے بھی اسے مثبت جواب نہ ملتا۔ نتاشا کی جانب سے مثبت جواب اور گرمجوشی کی وجہ سے وہ لوگوں کی باتوں پر دھیان نہ دیتا تھا۔ وہ پیار کے نشے میں بے خبر تھا کہ موت آہستہ آہستہ اس کے تعاقب میں لگ چکی ہے۔

☆☆☆

ٹامی اس وقت اپنے حواس میں نہیں تھا اور اسے کسی صورت چین نہیں آ رہا تھا۔ سنسنی اور بلڈ پریشر سے اس کے ہاتھ پاؤں پھول رہے تھے اور اس کو اپنے گھر میں بھی سکون نہیں آ رہا تھا۔ وہ اپنے گھر میں اس وقت کونے کونے کو چیک کر رہا تھا جیسے کسی طوفان کی آمد سے پہلے حفاظتی انتظام کیے جاتے ہیں۔ وہ بھی آنے والے طوفان کے پیشِ نظر احتیاطی تدابیر کر رہا تھا۔

طوفان کسی آندھی یا بارش کے بجائے انسانی صورت میں اس پر نازل ہونے والا تھا۔ اس کے جسم میں تھرتھلی مچی ہوئی تھی اور وہ پورے گھر کو اسلحے خانے میں تبدیل کرنے میں لگا ہوا تھا۔ سب سے پہلے اس نے رائٹنگ ٹیبل کے نیچے ایک گن چپکا دی تھی۔ دوسری گن کچن میں فریج کے اوپر اسٹینڈ کے نیچے چھپائی تھی، ایک اور گن واش روم میں واش بیسن کے پیچھے چھپا دی تھی۔

اپنے انتظامات پر ایک گہری نظر دوڑانے کے بعد اسے کسی قدر اطمینان ہوا۔ وہ خود کوئی معمولی انسان نہیں تھا

بلیک میلر

عکس فاطمہ

زندگی کی نعمتوں کو وبال سمجھنے والے بالآخر ایسے جنجال میں الجھتے چلے جاتے ہیں کہ پھر نکلنے کا راستہ کھوجنے سے بھی نہیں ملتا... ایسے ہی گورکھ دھندے میں پڑ کر اپنی زندگی کو تہ و بالا کر دینے والے شخص کا سنسنی خیز ماجرا...

ایک ایسی کہانی جس کا ہر کردار افواہوں کی زد میں تھا......

موریس برک اور ڈینس پولاک فارغ وقت میں تاش کھیل رہے تھے۔ قریب ہی موریس کا پالتو کُتا ٹانگیں پسارے بیٹھا ہوا تھا کہ ٹیلی فون کی گھنٹی بجی۔ دوسری جانب موریس برک انویسٹی گیشن کی آفس منیجر اور استقبالیہ کلرک گریٹا تھی۔ اس نے بتایا کہ اسٹارلائٹ پکچرز کا جیری سلور برگ اس سے بات کرنا چاہ رہا ہے۔ ایک ماہ پہلے ہی موریس اور سلور برگ کی گفتگو ہوئی تھی جب وہ ایک سیریل کلر مووی کے سلسلے میں اس سے مشورہ کرنا چاہ رہا تھا لیکن موریس نے معذرت کر لی کیونکہ وہ سیریل کلرز کو پکڑنے میں دلچسپی رکھتا تھا اور نہ ہی ان سے متعلق مووی میں مشورہ دینا چاہتا تھا تاہم اب اس نے ایسی پیشکش کے بارے میں دوبارہ سوچنا شروع کر دیا تھا کیونکہ پچھلے چند ہفتوں سے کام مندا تھا۔ اسی لیے وہ صبح کا وقت پولاک کے ساتھ رمی کھیل کر گزارتا جبکہ اس کے دوسرے دو سراغ رساں فریڈ لیمن اور چارلی بوگل چھٹی پر چلے گئے تھے۔ اس نے گریٹا سے کہا کہ وہ سلور برگ سے لائن ملا دے۔

”مجھے اسکاٹ رے برن کو تلاش کرنے میں تمہاری مدد کی ضرورت ہے۔“ اسٹوڈیو ایگزیکٹو نے کہا۔

موریس کو یہ نام کچھ جانا پہچانا لگا۔ اس نے پوچھا۔ ”یہ رے برن کون ہے؟“

”ایک اداکار جو ہماری فلم میں کام کر رہا ہے۔ وہ غائب ہو گیا ہے اور اس کی وجہ سے ہمارا بہت نقصان ہو رہا ہے۔“

”کیا تم نے اُس کے ایجنٹ سے رابطہ کیا؟“

”ہاں لیکن اسے بھی کچھ معلوم نہیں۔ اب تم کیا کہتے ہو برک؟ کیا تم اس سلسلے میں ہماری مدد کر سکتے ہو؟“

موریس نے اپنے کُتے پارکر کی طرف دیکھا اور مسکرا دیا۔ سیریل کلر کے مقابلے میں کسی گمشدہ شخص کو تلاش کرنا زیادہ دلچسپ اور قابلِ ترجیح ہوتا۔ ان دونوں کے درمیان فیس وغیرہ کے معاملات طے ہوئے اور سلور برگ نے اپنے ایک معاون کی ڈیوٹی لگا دی کہ وہ موریس کو تمام متعلقہ معلومات فراہم کرے۔ ٹیلی فون رکھنے کے بعد اس نے پولاک کو بھی سلور برگ سے ہونے والی گفتگو کی تفصیل بتا دی۔

”رے برن کا ایک گھر وینس میں ہے۔ میں وہاں کا چکر لگاتا ہوں۔ تم بھی اپنے طور پر اس کے بارے میں معلومات حاصل کرو۔“

پولاک کے جانے کے بعد موریس نے تین جگہ فون کیا۔ اس نے پہلی کال رے برن کے ایجنٹ بروس فورک کو کی۔ اس کے معاون نے بتایا کہ ایجنٹ اس وقت ایک میٹنگ میں ہے لیکن فارغ ہوتے ہی وہ پہلی فرصت میں موریس کو فون کرے گا۔ دوسری کال اس نے اداکار فلپ اسٹون کو ملائی جو وائس میل پر چلی گئی۔ تیسری کال اس نے اینی والش کو کی اور اس سے کہا کہ کیا وہ رے برن کے حالیہ کریڈٹ کارڈ چارجز کے بارے میں معلومات فراہم کر سکتی ہے۔ وہ موریس کی پرانی ساتھی تھی جب وہ لاس اینجلس

رانگی

سرور اکرام

زندگی واقعی میں ایک کھیل ہے... ہر شخص اپنے حصے کی اننگز کھیلتا ہے اور رخصت ہو جاتا ہے... ہزاروں نفوس کی موجودگی کے باوجود ہرسو ٹھہراؤ اور سکوت کا عالم چھایا ہوتا ہے... انسان کی آخری گاہ... جو ہر شخص کا آخری مسکن ہے... اس پُرسکوت ماحول میں اچانک ہی ہلچل ہوئی... پھر خوف و پُراسراریت پھیلتی چلی گئی...

ایک گورکن کو پیش آنے والے پُرہول واقعات کا احوال......

رات بہت بھیانک تھی۔ اس بھیانک پن کو مسلسل ہوتی بارش نے اور بڑھا دیا تھا لیکن ابھی بارش رکی ہوئی تھی۔ اسی لیے سناٹا سا ہو گیا تھا۔

شمشو نے ایک آواز سنی اور اٹھ گیا۔ یہ آواز بہت قریب سے آئی تھی۔ یہ کسی کے کراہنے کی آواز تھی۔ اس نے کبھی خوف محسوس نہیں کیا تھا۔ اس کا واسطہ زندگی سے کم اور موت سے زیادہ پڑتا تھا۔

وہ ایک گورکن تھا۔ جب سے اس نے ہوش سنبھالا تھا،

یہی قبرستان تھا۔ یہی ماحول تھا۔ اس کا باپ بھی ایک گورکن تھا۔ شمشو کو یہ کام اسی نے سکھایا تھا۔ اس کے باپ نے یہ کام اپنے باپ سے سیکھا تھا اور اس نے اپنے باپ سے، شاید اس کے خاندان میں یہ کام اس وقت سے چلا آرہا ہو جب سے مرنے اور دفن کرنے کا سلسلہ شروع ہوا ہو۔

اس کی بھی کیا زندگی تھی؟

اس نے شادی بھی کی تھی۔ اپنی ہی برادری کی ایک لڑکی سے۔ جس کا نام جیون تھا۔ نام تو جیون تھا لیکن وہ زیادہ جی نہیں سکی۔ اس کا انتقال اس وقت ہوا جب ان کی بیٹی رانگی تین سال کی تھی۔

رانگی بہت پیاری بچی تھی۔ دونوں میاں بیوی اس بچی کو دیکھ دیکھ کر نہال ہوتے رہتے تھے۔ شمشو کبھی کبھی یہ سوچتا کہ اس کی بچی بھی کیا قسمت لے کر پیدا ہوئی ہے۔ جوان ہونے سے پہلے ہی اس کو قبرستان نصیب ہوگیا۔ وہ قبروں کے درمیان کھیلتی رہتی ہے اور کبھی کبھی اپنے باپ سے ایسے سوالات بھی کرتی ہے جن کے جواب ان کے پاس نہیں ہوتے تھے۔

ایک سوال تو یہ تھا کہ بابا یہ لوگ زمین کے اندر کیوں چلے جاتے ہیں۔ اس وقت شمشو کچھ نہ کچھ بول کر اسے خاموش کروا دیتا۔ جیون بھی رانگی کے سوالوں کے جواب دیتی رہتی تھی۔

نہ جانے کیوں اپنی جھونپڑی سے باہر آتے ہی شمشو کو پرانی باتیں یاد آنے لگی تھیں۔ اسے وہ دن بھی یاد تھا جب رانگی بڑی ہوگئی تھی۔

پہلی بار وہ شمشو کے ساتھ بازار گئی تھی، اپنے کپڑے خریدنے۔ اسے باہر کی دنیا بہت عجیب اور بہت انوکھی لگ رہی تھی۔

اس نے اپنی پسند کے رنگ برنگے کپڑے خریدے۔ بہت سی چوڑیاں بھی لیں۔ اور ایک سینڈل بھی خریدی تھی۔

شمشو اس کی ہر فرمائش پوری کر کے خوشی محسوس کررہا تھا لیکن پھر یہ ہوا کہ اس کی خوشیاں دیر تک نہ رہ سکیں۔ ماں کی موت کے کچھ دنوں کے بعد رانگی بھی مر گئی۔ قبروں کے درمیان کھیلنے والی بچی خود بھی ایک قبر میں جا کر سو چکی تھی۔

کسی کے کراہنے کی آواز اسے واپس لے آئی تھی۔ بہت قریب کی آواز تھی۔ اس کی جھونپڑی کے قریب سے آرہی تھی۔ ایک لمحے کے لیے وہ خوف زدہ ہوگیا۔ اس نے بہت کچھ سن رکھا تھا کہ جب رات اندھیری ہو تو روحیں قبروں کے درمیان بھٹکا کرتی ہیں۔ اپنے چاہنے والوں، اپنے پیاروں کو آوازیں دیتی ہیں۔ اس کے باپ نے اسے کچھ دعائیں یاد کروا دی تھیں۔ جتنا اسے یاد تھا۔ شمشو نے وہ دعائیں اچھی طرح یاد کر رکھی تھیں۔

اس نے وہی دعائیں زور زور سے پڑھنی شروع کر دیں۔ لیکن آوازوں کا سلسلہ ختم نہیں ہوا۔ کوئی مسلسل کراہ رہا تھا۔ بہت کرب تھا اس آواز میں۔ بہت بے بسی تھی۔ شمشو کو احساس ہوگیا کہ یہ آواز اس تازہ قبر سے آرہی ہے جو آج ہی بنی ہے۔ وہ اس کی جھونپڑی کے بالکل برابر میں تھی۔

قبرستان بھرتا جارہا تھا۔ بہت کم جگہیں بچی تھیں۔ اس کی جھونپڑی کے برابر بھی کچھ جگہ تھی۔ وہ قبر اسی جگہ بنائی گئی تھی۔ شمشو دل ہی دل میں دعائیں پڑھتا ہوا اس قبر کے پاس پہنچ گیا۔ ایک بار پھر وہی کراہ سنائی دی۔

اب اس میں کوئی شک نہیں رہ گیا تھا کہ وہ کراہ اسی قبر سے سنائی دے رہی تھی۔

ابھی بارش تھمی ہوئی تھی لیکن جتنی بارش ہو چکی تھی، اس نے قبر کے اوپر کی مٹی بہت حد تک ایک طرف کر دی تھی۔ آواز پھر آئی۔ اور شمشو کو اس بار یقین ہوگیا کہ قبر میں کوئی ہے۔ جس کو دفنایا گیا ہے وہ زندہ ہے۔ اس نے بالکل واضح آواز سنی تھی۔ اس کو یہ معلوم تھا کہ یہ قبر کسی لڑکی کی ہے۔ لاش لانے والوں نے یہ بتایا تھا۔ اس کے علاوہ مرد اور عورت کی لاشوں کا اندازہ ہو ہی جاتا ہے۔

تو کیا جس کو دفنایا گیا تھا، وہ زندہ تھی۔ مری نہیں تھی لیکن یہ کیسے ہوسکتا تھا۔ اس کے قبرستان میں ایسا واقعہ تو پہلے کبھی نہیں تھا۔

اس نے کہانیاں سنی تھیں کہ فلاں قبر کا مردہ زندہ ہو گیا۔ فلاں کے ساتھ ایسا ہوا لیکن اس کے ساتھ یہ پہلا واقعہ رونما ہوا تھا۔

اسی وقت بادل زور زور سے گرجنے لگے۔ شمشو نے آسمان کی طرف دیکھا۔ بارش کسی بھی لمحے پھر شروع ہونے والی تھی۔ اس کے ساتھ ہی کراہ اور تیز ہوگئی۔ کلمہ پڑھتے ہوئے شمشو نے قبر کے اوپر سے کچھ مٹی ہٹا دی۔ اب اتنا سوراخ ہوگیا تھا کہ اندر پڑی ہوئی لاش دکھائی دے سکتی تھی۔

ابھی اس قبر کو پختہ نہیں کیا گیا تھا۔ کفن کے اندر سے مردہ یا لاش ہل رہی تھی۔ اس اندھیرے کے باوجود شمشو کو اس لاش کی حرکت دکھائی دے رہی تھی۔ اس سرد موسم میں بھی اسے پسینے آنے لگے۔

او خدا یہ مردہ نہیں بلکہ زندہ ہے۔ کراہ اب اور صاف ہوگئی تھی۔ شمشو دوڑا ہوا اپنی جھونپڑی میں واپس آیا، اس نے کدال اٹھائی اور واپس پلٹ کے قبر تک آیا۔

کچھ دیر کی محنت کے بعد اس نے کفن میں لپٹی اس

بعد از گناہ

ایچ اقبال

کچھ لوگوں کے خواب بالکل آگ کی طرح ہوتے ہیں... جس کی تعبیر پانے تک وہ جلتے ہی رہتے ہیں... ایک ایسی ہی دوشیزہ کا قصّہ... جس کی آنکھوں میں اونچے خواب سجے تھے... ان خوابوں کو پانے کے لیے اسے کسی سہارے کی ضرورت تھی... خوش قسمتی سے اسے خوابوں کی تکمیل کے لیے ایک سہارا مل ہی گیا... آسودگی... فرحت اور مال و زر نے اسے اپنا اسیر کر لیا... مگر ان جلتے خوابوں کے لیے اپنے جسم کو دہکانا پڑتا ہے... اس زیاں اور کرب کا احساس اسے بہت تاخیر سے ہوا...

محبت اور اعتماد...... رشتوں اور جذبوں کے

ریزہ ریزہ ہوجانے کا عبرت اثر ماجرا......

سائرہ بوکھلاہٹ کے باعث ائرکنڈیشنڈ کوپے سے باہر نکل آئی تھی اور پھر اس نے فراٹے بھرتی ہوئی ٹرین سے باہر چھلانگ لگا دی۔ اس کے علم میں تھا کہ ٹرین نے کو پل پر سے گزرنا شروع کر دیا تھا اور پل کے نیچے دریا بہہ رہا تھا۔ اسے ڈر نہیں ہے کہ وہ زمین سے ٹکرا کر اپنی ہڈی پسلی ایک کروا بیٹھتی...... اسے تیرنا...... آتا تھا۔

کچھ گہرائی تک جانے کے بعد اس نے ہاتھ پیر مارنے شروع کر دیے تاکہ سطحِ آب پر ابھر سکے۔ اس کا سر جب پانی سے ابھرا تو اس نے ٹرین کے انجن کی آواز سنی۔ اپنے پانی میں شرابور بال چہرے سے ہٹاتے ہوئے ٹرین کے انجن کی سیٹی سنی۔ اس وقت ٹرین کا آخری ڈبا پل پر سے گزر رہا تھا۔

سائرہ اپنی پھولی ہوئی سانسیں درست نہیں کر پائی تھی کہ اس نے ایسی آواز سنی جیسے دریا میں کچھ گرا ہو لیکن وہ ”کچھ“ کیا تھا؟ یہ سائرہ سمجھ گئی تھی۔ وہ لاروش ہی ہو سکتا تھا جس نے اس کا سر پانی سے ابھرتے دیکھ کر خود بھی دریا میں چھلانگ لگا دی تھی۔ وہ سائرہ کا پیچھا چھوڑنے کے لیے تیار نہیں تھا۔

اگرچہ رات کا وقت تھا لیکن چاندنی اتنی تھی کہ سب کچھ مکمل طور سے اندھیرے میں چھپا ہوا نہیں تھا۔

لاروش کے کودنے کی آواز اس طرف سے آئی تھی جس طرف ٹرین جا رہی تھی اس لیے سائرہ نے مخالف سمت میں تیرنا شروع کر دیا۔ اسے ہر قیمت پر لاروش سے بچنا تھا۔ اس سے بچنے ہی کے لیے تو اس نے ٹرین سے دریا میں چھلانگ لگائی تھی۔ پھولی ہوئی سانسوں کے باوجود اس نے زیادہ سے زیادہ تیزی سے تیرنا شروع کر دیا تھا۔ وہ سمجھ گئی

سرورق کی دوسری کہانی

خواب عذاب

کبیر عباسی

تیکھے... پتھریلے اور خطرناک راستوں سے ہر شخص ڈرتا ہے... جیسے سانپوں کو پہاڑوں میں موجود بلوں اور سوراخوں میں رینگنا پڑتا ہے... اس لیے قدرت نے اس کا جسم اس قدر بل دار بنایا ہے... مگر انسان، سانپ نہیں ہے... اسے صاف ہوائیں اور سیدھے راستے پسند ہیں... اس کے باوجود کسی انسان کی زندگی بالکل سانپ کے بل دار جسم کے مانند گزرتی ہے... سیدھے کے بجائے ہمیشہ ٹیڑھے میڑھے راستے اس کے منتظر رہتے ہیں... گل کے بجائے ہر راہ پر خار خار ہی اس کے جسم کو چھلنی کررہے ہوتے ہیں... دکھوں... بے اعتمادی اور شکست سے دوچار ہوجانے والی پُرالمیہ داستاں...

آنکھوں میں بسے خوابوں سے دور عذابوں سے

قربت نبھانے والوں کا سفرِ سراب......

دوپہر کا وقت تھا۔ سورج آگ برسا رہا تھا۔ ایسے میں ایک پرانے ماڈل کی پیجرو مین روڈ چھوڑ کے ایک نیم پختہ راستے پر مڑی۔ پیجرو میں کل چار افراد سوار تھے۔ دو مرد اور دو خواتین۔ انہیں سفر کرتے ہوئے ڈیڑھ گھنٹے سے زائد وقت ہو چکا تھا۔ سورج کی تپش سے بے نیاز، اے سی کی خنکی میں پختہ راستے پر اُن کا سفر سکون سے جاری تھا لیکن گاڑی کے مڑتے ہی ان کے پرسکون سفر میں خلل پڑ گیا۔

ڈرائیور کے ساتھ والی نشست پر ایک چالیس

بیالیس سالہ شخص اونگھ رہا تھا۔ گاڑی مڑتے ہی جھٹکا لگا، اس نے چونک کے سامنے دیکھا۔ سامنے کا منظر اس کے لیے شناسا تھا۔ اس نے نشست کے ساتھ ٹیک لگا کے پھر سے آنکھیں موندلیں۔

گاڑی میں موجود دونوں خواتین عقبی نشست پر براجمان تھیں۔ مونا پُرسوچ انداز میں باہر کی طرف دیکھ رہی تھی۔ وہ نازک سے نقوش کے ساتھ خوبصورت چہرے کی مالک تھی۔ کچے راستے پر مڑتے ہی کھیتوں کا سلسلہ شروع ہو گیا تھا۔ اس کی نظریں تو سامنے کے مناظر پر جمی تھیں لیکن ذہن دور سوچوں میں گم تھا۔ یہ سفر اس کی زندگی میں تبدیلی کا باعث بننے والا تھا۔ نئے لوگ، نئی جگہ...... لیکن وہ مستقبل سے بے خبر ماضی کے اوراق پلٹنے میں مصروف تھی۔

اس کے پہلو میں بیٹھی غزالہ اس کی کیفیات سے بے خبر سیل فون کے ساتھ مصروف تھی۔ وہ سیل پر کچھ ٹائپ کر رہی تھی لیکن گاڑی کو لگنے والے پے در پے جھٹکوں کی وجہ سے اسے دقت پیش آرہی تھی۔

''کیا مصیبت ہے؟'' وہ بڑبڑائی۔ ''انکل! تھوڑا، آہستہ گاڑی چلائیں۔ ہمارے پیچھے کوئی گیارہ ملکوں کی پولیس تونہیں لگی ہوئی۔'' الفاظ کے برعکس اس کے لہجے سے بیزاری نمایاں تھی۔

ڈرائیور نے بغیر کچھ کہے رفتار کم کر دی۔ مونا نے ایک لمحے کے لیے اسے دیکھا اور پھر سے شیشے سے باہر دیکھنے لگی۔ سورج کے ستم سہتی کھیتوں میں لہلہاتی فصلیں بھی جیسے مغموم کھڑی تھیں۔ مونا کے لیے یہ مناظر نئے تھے لیکن اسے ان میں کوئی دلکشی محسوس نہیں ہو رہی تھی۔ وہ شیشے سے سر ٹکائے ماضی کے کے دھندلکوں میں گم تھی۔

یہ زندگی بھی انسان سے کیسے کیسے امتحان لیتی ہے۔ ان راستوں کا راہی بنا دیتی ہے جن پر سفر کا گمان بھی نہیں ہوتا۔ وہ اگر یہ سوچ رہی تھی تو ایسا سوچنے میں حق بجانب تھی۔

اس نے اپنی بائیس سالہ زندگی میں بہت سے نشیب و فراز دیکھے تھے۔ اس کی ماں نے اس کے باپ کے ساتھ گھر سے بھاگ کے شادی کی تھی۔ جس کی وجہ سے اس کا باپ اس کی ماں پر اعتبار نہیں کرتا تھا۔ اس پر بہت سی پابندیاں عائد تھیں۔ اسے پڑوس تک میں جانے کی اجازت نہیں تھی اور نہ ہی کوئی ان کے گھر آتا تھا۔ اس کی ماں ان پابندیوں کی وجہ سے گھٹن کا شکار تھی۔ وہ اپنی اولاد پر بھی توجہ نہ دیتی تھی۔ اس کے باپ کا گھر کے سامنے ہی جنرل اسٹور تھا۔ اس کی نگران نگاہیں ہر وقت اپنے گھر کے گیٹ پر مرکوز رہتی تھیں۔

اس کے ماں باپ کے حالات نے دونوں کو عجیب طرح کے نفسیاتی عارضوں میں مبتلا کر دیا تھا۔ دونوں نے اپنی ہی الگ دنیا بسائی ہوئی تھی، جس میں باہر کے کسی شخص کا گزر تک نہ تھا۔

مونا کی پرورش ایسے ہی ہوئی تھی جیسے ایک خودرو پودے کی ہوتی ہے۔ اس کا باپ اس کے ساتھ بھی سختی سے پیش آتا تھا۔ اس کا ایک چھوٹا بھائی تھا۔ ماں کی طرف سے تو وہ بے توجہی کا شکار تھا تاہم وہ باپ کی آنکھ کا تارا تھا۔ مونا بہت حساس تھی۔ وہ بھائی کے ساتھ باپ کا التفات دیکھ کے کڑھتی تھی۔ بے بسی اس کی آنکھوں میں آنسو بھر دیتی لیکن وہ سمجھوتے پر مجبور تھی۔

پھر اس نے کتابوں میں پناہ لے لی۔ ہر کلاس میں وہ اول آتی، استانیاں اس کے گن گاتیں لیکن گھر میں اس کی قابلیت کی داد دینے والا کوئی نہ تھا۔ زندگی جیسے تیسے گزر رہی تھی مگر پھر اس کی زندگی میں انقلاب آگیا۔ اس نے تیرھویں سن میں قدم رکھا ہی تھا کہ اس کے باپ نے اس کا اسکول چھڑوا دیا۔ وہ بہت روئی پیٹی...... لیکن یہ سب اس نے تنہائی میں کیا تھا۔ باپ کے سامنے تو وہ احتجاج تک کا حق نہیں رکھتی تھی۔

اب گویا وہ گھر میں محبوس تھی۔ تنہائی اسے کاٹ کھانے کو دوڑتی۔ وہ وحشت زدہ سی گھر میں پھرتی رہتی۔ وہ ماں سے بات چیت کی کوشش کرتی لیکن وہ ہوں...... ہاں سے زیادہ بات ہی نہ کرتی۔ وہ ہر وقت خیالوں میں کھوئی رہتی۔ گھر کا کام بھی وہ مارے باندھے کر دیتی تھی۔ ماں کی حالت دیکھ کے مونا دل ہی دل میں کڑھتی لیکن بہت سے دوسرے معاملات کی طرح یہاں بھی بے بس تھی۔ چھوٹے بھائی کو حاکمانہ مزاج ورثے میں ملا تھا۔ وہ بہن تو بہن ماں سے بھی حکمیہ انداز میں بات کرتا۔

اسکول سے آنے کے بعد وہ باہر نکل جاتا اور سرِشام ہی لوٹتا۔ مونا اس سے بات کرنے کی کوشش کرتی تو وہ اسے جھڑک دیتا۔ گھر میں ٹی وی اور رسائل تک کی کوئی جگہ نہیں تھی۔ گھر کا کام وہی کرتی تھی لیکن چار نفوس پر مشتمل گھر میں کام ہی کتنا ہوتا تھا، وہ صبح دس بجے سے بھی پہلے فارغ ہو جاتی۔ اس کے بعد وہ ہوتی اور اس کی تنہائی۔ وہ بستہ کھول کے اپنی پرانی کتابیں کھول کے بیٹھ جاتی۔ یہ کتابیں بھی اسے ازبر ہو چکی تھیں۔ اس نے سلائی کڑھائی کی مشق شروع